راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

مدیر اعلیٰ : عامر بن علی
مدیر : حسن عباسی

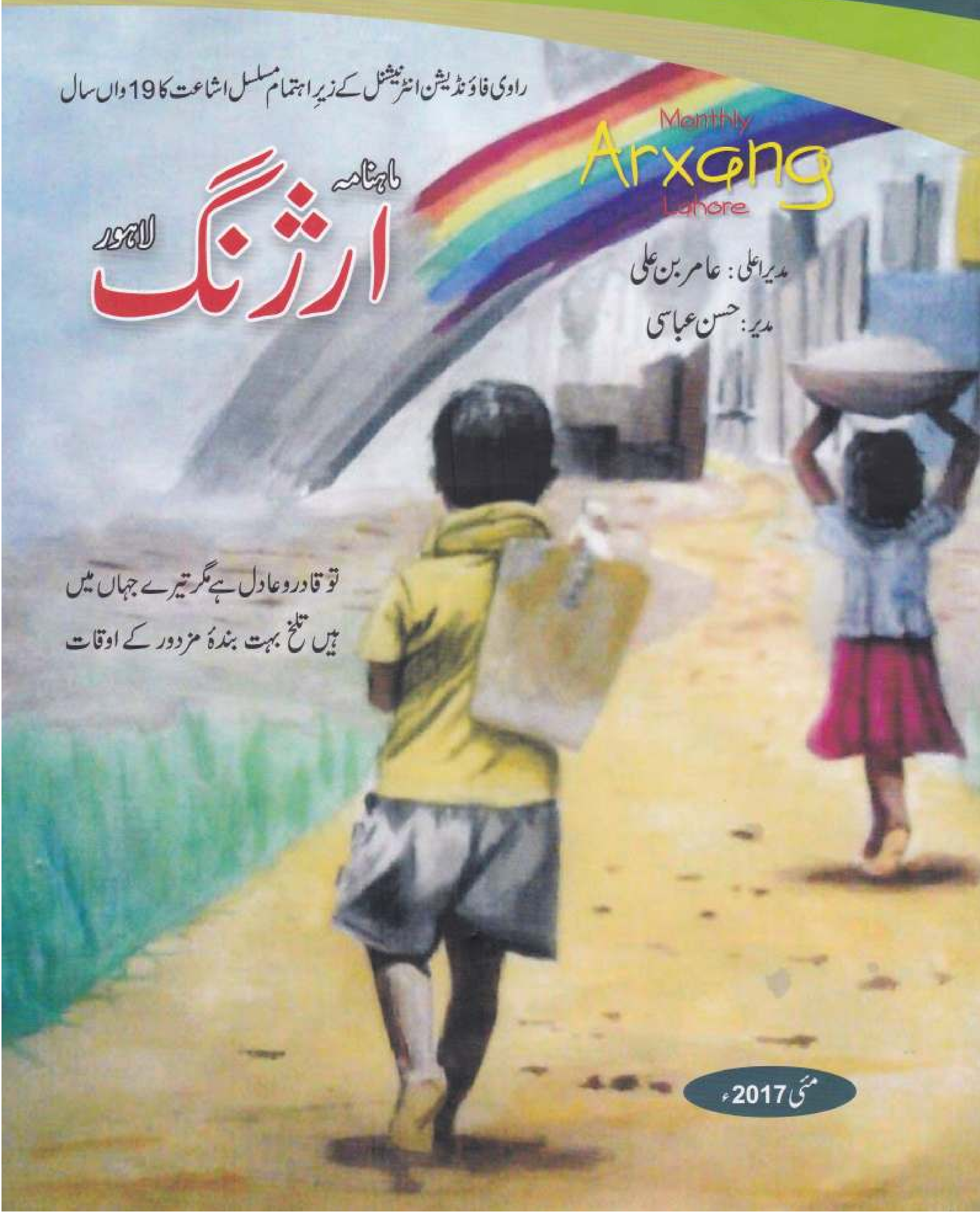

تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات

مئی 2017ء

بسلسلہ یوم پاکستان

شائقینِ فن دوحہ اور مجلسِ فروغ اردو قطر

کے اشتراک سے

عالمی مشاعرہ بیادِ جمیل الدین عالی

ملک مصیب الرحمٰن انٹرنیشنل ایوارڈ

تقریب کی تصویری جھلکیاں

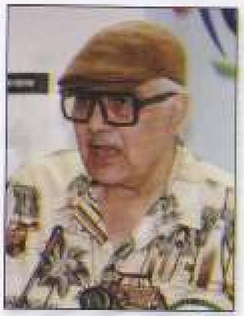

جمیل الدین عالی

صدر انجمن ترقی اردو

سٹیج کی تصویر

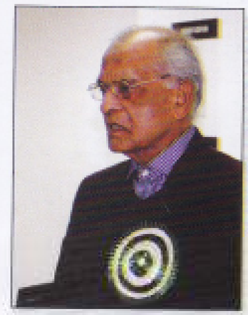

محمد عتیق چیئرمین

عباس تابش

مہمان شعرا تقریب کے منتظمین کے ساتھ

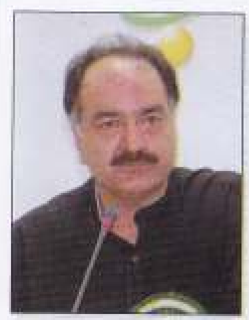

خالد سجاد احمد

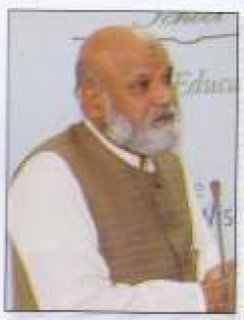

سرفراز خانزادہ (سابق سفیر پاکستان)

سامعین کی تصویر

عامر بن علی

فرتاش سید (نظامت)

عامر بن علی نامور شاعر آصف شفیع کو اپنی کتاب پیش کر رہے ہیں

راوی فاؤنڈیشن انٹرنیشنل کے زیرِ اہتمام مسلسل اشاعت کا 19 واں سال

Monthly
Arxang
Lahore

عالمی سطح پر اردو ادب کا ترجمان

ماہنامہ
ارژنگ
لاہور

جلد نمبر 19 • مئی 2017ء • شمارہ نمبر 5

مدیر اعلیٰ ◉ عامر بن علی

مدیر ◉ حسن عباسی

{مجلس ادارت}

ڈاکٹر صغرا صدف ◉ ابرار ندیم ◉ ڈاکٹر جعفر حسن مبارک
◉ حافظ مظفر محسن ◉ سعدیہ سیٹھی (برطانیہ)

{مجلس مشاورت}

محمود ظفر اقبال ہاشمی (سعودی عرب) ◉ ظفر خان (آسٹریلیا) ◉ ارشد ندیم ساحل (جاپان)
محمد ادریس لاہوری (ناروے) ◉ ناز اوکاڑوی ◉ لبنیٰ صفدر

کمپوزنگ • رباب کمپوزنگ : 0321-4730769 فوٹوگرافر • نعمان حسن : 0333-4918383

آرٹ اینڈ گرافکس • محمد احسن گل : 0300-4529821

پتہ برائے خط و کتابت

ماہنامہ ارژنگ

F-3 الفیروز سنٹر غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور

حسن عباسی : 0300-4489310 ناز اوکاڑوی : 0301-4492133

nastalique786@gmail.com

سالانہ ممبرشپ

ماہنامہ "ارژنگ" کے سالانہ خریدار بننے کے لیے مندرجہ ذیل نام اور شناختی کارڈ پر مبلغ -/1000 روپے بذریعہ جاز کیش/ایزی پیسہ/موبی کیش/یو پیسہ یا پی ایل او بی سے رقم بھیجیں اور سالانہ خریدار بن جائیں۔ مجلے کی کاپی اعزازی بھیجی جائے گی۔

(حسن گھمن)

0300-4489310

31304-7298386-9

فہرست

حمد و نعت ، ۲

مضامین:

- مجید امجد......اصل حقائق / نعیم نقوی ، ۳
- ہمارا موجودہ معاشرہ منٹو کی تحریروں کے آئینے میں / عائشہ عظیم ، ۷
- سحر جمیل مشن سالم / وجاہت مسعود ، ۹
- علی رضا ایک ہمہ جہت شخصیت / ذکاء اللہ انجم ملغانی ، ۱۲
- روماجی / عامر بن علی ، ۱۳

شعری گوشے: اظہر عنایتی، باقی احمد پوری، احمد عطاء اللہ، کنول ملک، علینا عترت، گل جہاں، ثمریہ قاضی ۱۴ تا ۲۰

افسانے:

- آخری فیصلہ / ایوب صابر ، ۲۱
- تضاد / سعدیہ بتول ، ۲۴
- افسانچے / ڈاکٹر عمرانہ مشتاق ، ۲۶

شاعری (غزل، نظم) ، ۲۸

سفرنامے:

- تھائی لینڈ / وحید قندیل (آسٹریلیا) ، ۳۳
- مسافر ہوں یارو / ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار ، ۳۷
- بارسلونا بارسلونا / احمد سعید (پرتگال) ، ۳۹
- جہاں گردی / عامر بن علی (جاپان) ، ۴۱
- تتلیاں ستاتی ہیں / حسن عباسی ، ۴۳
- ڈاکٹر عاشق رحیل (بقیہ انٹرویو) ، ۴۶

مختصر ادبی خبریں ، ۵۰

تبصرۂ کتب ، ۵۲

نامہ ہائے احباب ، ۵۴

Far East Marketing Co.

Samaria Mansion 605 Koenji-Minami 1-6-5
Suginami-Ku, Tokyo, 166-0003 Japan
E-mail: femc1@hotmail.com

حمد باری تعالیٰ

حاصلِ ذہنِ رسا ہے تیری ذات
معرفت کی انتہا۔ ہے تیری ذات
سب زمانوں کی بنا ہے تیری ذات
اے خدا معجز نما ہے تیری ذات
جس میں بادِ صبا ہے تیری ذات
ظلمتِ شب میں دیا ہے تیری ذات
بے نواؤں کی نوا ہے تیری ذات
عاصیوں کا آسرا ہے تیری ذات
ہر اندھیرے کی دوا ہے تیری ذات
اے خدا کامل ضیا ہے تیری ذات
محورِ فہم و ذکا ہے تیری ذات
مرکزِ رو بلا ہے تیری ذات
لازوال و لافنا ہے تیر ذات
تا ابد کا مرحلہ ہے تیری ذات
مدعا اپنی زباں سے کیا کہوں
رازِ دل سے آشنا ہے تیری ذات
ایک تو ہی سب یقینوں کا یقیں
واہموں سے ماورا ہے تیری ذات
ہر عبادت سے اُسے افضل کہوں
جس عبادت کا صلہ ہے تیری ذات
ہر مفکر کا یہی ہے تجزیہ
ہر تصور سے ورا ہے تیری ذات

ممتاز راشد لاہوری/لاہور

حمد باری تعالیٰ

چاہے موسم خراب ہے صاحب
جاب تو پھر بھی جاب ہے صاحب
پاس میرے عمل نہیں کوئی
ہاں مگر ایک خواب ہے صاحب
خود پہ ایمان کیوں نہ لاؤں میں
میرے اندر کتاب ہے صاحب
اس کا نعم البدل کوئی رکھتے
دل کی نعمت عذاب ہے صاحب
امتحاں میں سوال اور ہیں کچھ
اور میرا نصاب ہے صاحب
میں نے شعلے کو چھو کے دیکھا ہے
اُس کے اندر گلاب ہے صاحب
گر میں خود کو معاف کرتا ہوں
کوئی اس کا ثواب ہے صاحب
ہوش میں کوئی بات کیسے ہو
شاعری تو شراب ہے صاحب

حسن عباسی/لاہور

نعت رسول کریم ﷺ

مہکا ہوا ہے ہر طرف گلزار آپؐ سے
انسانیت کا بڑھ گیا معیار آپؐ سے
جھونکا گیا ہے اس کو جہنم کی آگ میں
جو بھی ہوا ہے برسرِ پیکار آپؐ سے
انؐ کے طفیل فصلِ بہاراں ہے ہر طرف
پھولوں کی پتیوں میں ہے مہکار آپؐ سے
جو آ گیا حضورؐ کی محفل میں ایک بار
وہ تشنہ کام ہو گیا سرشار آپؐ سے
محشر میں ہوگی انؐ کی شفاعت حضورؐ کی
اُمید رکھ رہے ہیں گنہ گار آپؐ سے
ہر بار مجھ کو اذنِ حضوری نصیب ہو
یہ التجا حضورؐ ہے ہر بار آپؐ سے
مجھ پہ ندیم چشمِ کرم ہے حضورؐ کی
پایا ہے میں نے دیدۂ بیدار آپؐ سے

ریاض ندیم نیازی/سبی

نعت رسول کریم ﷺ

ہستی کا کچھ وجود نہ تھا آپؐ کے بغیر
خوشبو سے بے خبر تھی ہوا آپؐ کے بغیر
غنچوں کو آپؐ نے دیا اذنِ شگفتگی
باغوں میں آ نہ پائے صبا آپؐ کے بغیر
میری ہر اک دعا کا وسیلہ حضورؐ ہیں
کیا ہو قبول کوئی دعا آپؐ کے بغیر
صدیوں سے تار تار تھا پیرہنِ حیات
کرتا رفو یہ کون قبا آپؐ کے بغیر
میں آپؐ کے بغیر کسی کام کا نہیں
کوئی نہیں حضورؐ مرا آپؐ کے بغیر
ہے میرا افتخار غلامی حضورؐ کی
ورنہ مری بساط ہی کیا آپؐ کے بغیر

افتخار شوکت/لاہور

مجید امجد......اصل حقائق/ مجید امجد...... دورِ حاضر کا بڑا شاعر

نعیم نقوی

مجید امجد 29 جون 1914 کو جھنگ صدر کے ایک معزز اور تعلیم یافتہ علمی ادبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم اور انٹرمیڈیٹ تک گورنمنٹ کالج جھنگ سے حاصل کی۔ گریجوایشن کی ڈگری اسلامیہ کالج لاہور (ریلوے روڈ) سے 1934ء میں حاصل کی۔ جھنگ واپس لوٹنے پر ایک ہفت روزہ اخبار ''عروج'' کے ساتھ وابستہ رہے کم وبیش پانچ سال عروج کے مدیر رہے دوسری جنگ عظیم کا آغاز ہو چکا تھا۔ عروج میں اُن کی نظم ونثر شائع ہوتی رہیں۔ انہی دنوں میں برطانوی سامراج کے خلاف اُن کی نظم ''قیصریت'' عروج کے صفحہ اول پر شائع ہوئی۔ جس کی پاداش میں ''عروج'' چھوڑنا پڑا۔ اور ڈسٹرکٹ بورڈ جھنگ میں کلرک بھرتی ہو گئے۔ ۱۹۴۴ء میں سول سپلائی ڈیپارٹمنٹ کا قیام عمل میں آیا۔ ٹیسٹ دیا اور انسپکٹر کا تقرر ہوا چند سال بعد ترقی پا کر اسسٹنٹ فوڈ کنٹرولر بن گئے۔ پنجاب کے چند چھوٹے بڑے قصبوں اور شہروں میں مختصر عرصہ قیام رہا اور تبادلے ہوتے رہے حتیٰ کہ منٹگمری (ساہیوال) پہنچے۔ یہاں ایسے آئے کہ یہیں کے ہو کر رہ گئے۔ اس شہر کی فضاء، ماحول، لوگوں کا برتاؤ، باسیوں کی محبت اور اُن کی چاہت نے تا دمِ مرگ یہیں کا کر لیا۔ 25 برس سے زیادہ وقت یہیں گزارا۔ وہ غمی خوشی کے موقع پر جھنگ جاتے، دوستوں عزیز و اقارب سے ملتے، شامل ہوتے اور واپس ساہیوال آ جاتے۔ حتیٰ کہ ۱۹۷۲ء میں ریٹائرمنٹ کے بعد بھی وہ یہیں رہے، انتقال سے چند روز پہلے جھنگ تشریف لے گئے اور دو تین روز بعد چند عزیزوں اور دوستوں سے مل کر واپس ساہیوال آ گئے۔ (بقول شیر افضل جعفری)

اب ہم اس مسئلے کی طرف آتے ہیں جو چند ایک نقاد اور ادبی مورخ اُٹھا رہے ہیں۔ وہ مسئلہ یہ ہے کہ ''وہ یہاں مالی پریشانیوں کا شکار رہے کسمپرسی کے عالم میں زندگی بسر کر رہے تھے۔ کھانے پینے، دوا دارو سے لاچار، ہانک و پکار کو کوئی نہ تھا۔ بھوکے، بُرے حال بند کمرے میں میت پائی گئی۔ کسی نے توجہ نہ دی۔''

بھائی! وہ لوگ آج بھی یہاں موجود ہیں اور جھنگ میں بھی ملیں گے۔ مجید امجد کا طرز زندگی معلوم کریں۔ مجید امجد نہایت حساس طبع انسان تھے۔ شاعرانہ اَنا تھی۔ فطری طور پر کم آمیز، خاموش طبع۔

مجید امجد تقریباً 49-1948ء میں ساہیوال تشریف لائے۔ نہ ہی بڑے زمیندار تھے کہ فیوڈل انداز زندگی ہوتا۔ خدمت گزار، ملازم، نوکر چاکر نہ ہی بیوروکریٹک طرز زندگی۔

وہ یہاں تن تنہا آئے نہ بیوی بچے نہ بہن بھائی اور اس شہر میں اُن کا کوئی دور یا قریبی عزیز بھی نہ تھا۔ ابتداء میں محلہ اسلام آباد گورنمنٹ ہائی سکول کے سامنے، پھر شہر میں ایک دو جگہ بدل کر رہتے رہے۔ مگر تنہا، بالکل تنہا، دفتر جاتے، اپنے ٹھکانے پر واپس آتے کچھ دیر آرام کرتے اور تیسرے پہر شام کو شاعر ادیب اور دوستوں کے ساتھ معمولات میں مشغول ہو جاتے۔

جب ساہیوال پہنچے یہاں عطاء اللہ جنون، مولانا عطائی، اکرم خان قمر، جعفر شیرازی، حکیم محمود رضوی، حاجی

بشیر احمد بشیر، اسرار زیدی کچھ ہی عرصہ بعد منیر نیازی اور منیر نیازی صاحب کے ساتھ ارژنگ پبلیکیشنز کی ہفت روزہ ''سات رنگ'' اور اسرار زیدی سے مل کر کر'' خدمت'' رسالوں میں اپنی خدمات اور مشورہ جات سے نوازتے۔ اسی زمانے میں بزم فکر و ادب اور لائبریری کا اجراء کیا۔ ہفتہ وار ادبی پروگرام اور لائبریری کے لیے کتابوں کا ذخیرہ اکٹھا کرنے کی کاوشوں میں گزرتا رہا۔ صادق علی جوگی کا اسٹیڈیم ہوٹل اور رونق شاہ کے کیفے ڈی روز دوستوں اور حلقۂ احباب کی نشستوں کا مرکز ہوتے۔ سٹلائٹ ٹاؤن (فرید ٹاؤن) بسا تو وہاں F بلاک میں اپنے لیے کوارٹر لیا اور تادمِ مرگ یہیں رہے۔ اسی دور میں کچھ کچھ وقفے سے شاعر اور ادیبوں میں اضافہ ہوتا رہا۔ گوہر ہوشیار پوری، ظفر اقبال، لیسین قدرت، ناصر شہزاد، مراتب اختر، شاہد سلیم جعفری، طارق عزیز، اشرف قدسی، ڈاکٹر مہدی حسن، احسن شیرازی، امین رضا، عسکری حسن، فیاض قریشی، سعادت سعید، فہیم جوزی، سجاد میر، منظور اعجاز، ریاض پوسوال، مظہر ترمذی، خالد طور، سجاد میر، ریاض نقوی، انوار سیف، حامد جیلانی، ایزد عزیز، محمد امین، اساتذہ میں آغا امجد علی، راجہ عبدالقادر، جی ایم ڈین مرزا قیوم صبا، بسمل صابری،

جمیلہ ہاشمی، سائرہ ھاشمی، میمونہ کلثوم، ثمر ہاشمی، جمیلہ کیانی، فرخندہ لودھی۔ یہ سب وہ ہیں جو مجید امجد سے عقیدت رکھتے تھے۔ محبت کرتے تھے۔ اور اُن کا مقام جانتے تھے۔ اُن کو علم و ادب کے حصول کا ذریعہ مانتے تھے۔ اُن کی رائے حتمی جانی جاتی تھی۔

آج تک ساہیوال کے حلقے میں کوئی بھی ایسا فرد نہیں ملا جس نے دعویٰ کیا ہو کہ مجید امجد نے اُس کے ساتھ اپنے ذاتی یا خانگی مسئلے پر مشورہ کیا ہو یا بات کی ہو۔ نہ ہی انہوں نے کچھ کہا نہ ہی کسی نے بات کی محکمہ فوڈ کا ایک اہلکار غالباً چپڑاسی علی احمد اُن کی سروس کے دوران بھی اور ریٹائرمنٹ کے بعد بھی اُن کی خدمت کے لیے اُن کے ساتھ رہتا تھا۔

اُن کا معمول رہا روزانہ تیسرے پہر اسٹیڈیم ہوٹل پر آتے اور شام ڈھلنے سے پہلے واپس اپنے گھر لوٹ جاتے تھے۔ ویسے بینائی کمزور تھی ہی مگر رات کو بہت کم دکھائی دیتا۔ گھر پر کوئی نہ ہونے کی وجہ سے غالباً میزبانی کے فرائض اور تردد کو پیش نظر رکھتے ہوئے وہ ہر ملاقاتی کو اسٹیڈیم ہوٹل ہی مدعو کرتے۔ ساہیوال کے احباب اس بات کو جانتے تھے جس کو ملنا بیٹھنا ہوتا وہ شام کو اسٹیڈیم ہوٹل میں آجاتا نشست و برخواست ہوتی، اُن کے پاس اُن کی میز پر جو بھی آتا وہ اُن کا مہمان ہوتا۔ کبھی کسی نے جرأت نہیں کی کہ وہ بل ادا کر سکے۔ اس پر وہ بُرا مان جاتے اور سختی سے منع کر دیتے تھے۔

ایسی نپی تُلی زندگی بسر کرنے والے کے لیے کوئی کیسے چاہے کہ اُن کے معاملاتِ زندگی میں کھانے پینے اُٹھنے بیٹھنے سونے جاگنے دواداروں میں دخل دیں۔ رہا اُن کی میت کتنے دن کمرے میں فرش پر پڑی ہی تو اس روز علی احمد انہیں دوپہر کا کھانا کھلا کر خربوزہ کاٹ کر میز پر رکھ کر غالباً اپنے دفتر گیا اور معمول کے مطابق ڈیڑھ دو گھنٹے بعد واپس آیا روزانہ کا معمول تھا کہ وہ دفتر جاتے ہوئے باہر سے تالا ڈال جاتا اور واپسی پر کھول کر داخل ہو جاتا۔ اس روز بھی جب آیا تو بقول اس کے اس نے کرسی اور پلنگ کے درمیان انہیں گرے پایا، روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔ ہمسائے کی مدد سے میت پلنگ پر لٹائی ڈھلتے کی شام تھی جعفر شیرازی اپنے گھر آ چکے تھے۔ انہیں اطلاع دی، شیرازی صاحب نے اپنے بیٹے کو ایزد عزیز کو لینے بھیجا۔ ایزد کے آتے ہی شیرازی صاحب اور ایزد عزیز امجد صاحب کے گھر پہنچے علی احمد نے بابا جوگی کو اطلاع کی صادق علی جوگی صاحب نے ڈپٹی کمشنر جاوید احمد قریشی کو فون کیا۔ آپس میں رابطہ ہونے پر یہ طے پایا کہ امجد صاحب کی میت کو جھنگ روانہ کر دیا جائے کیونکہ امجد صاحب کے ورثا تو جھنگ میں رہتے تھے۔ اس زمانے میں ٹیلی فون پر کال بک ہوتی تھی جو گھنٹوں میں ملتی تھی بہرحال ڈی سی ساہیوال نے ڈی سی جھنگ کو مطلع کیا کہ مجید امجد کے بھائی عبدالکریم صاحب کو تلاش کر کے مطلع کر دیا جائے کہ امجد صاحب کی میت بھیجی جا رہی ہے۔ چند گھنٹے تک جھنگ پہنچ جائے گی۔ میت کیوں بھیجی گئی؟ یہ ایک سوالیہ نشان ہے اس کا جواب جاوید قریشی، بابا جوگی اور جعفر شیرازی کے پاس یہ ہے کہ ورثاء کے ہوتے ہوئے انہیں لاوارث قرار دے کر کس طرح اُن کی تدفین کی جا سکتی ہے۔

باقی دوستوں کو اطلاع کیوں نہ ہوئی؟؟ جدید موبائل فون تو موجود نہ تھے۔ گھر گھر میں فون نہ ہونا بھی بڑا اہم مسئلہ تھا۔ اور نہ اسٹیڈیم ہوٹل کے بیرے اُن شعراء اور لوگوں کے پتے جانتے تھے جو ملاقات کے لیے آتے تھے۔ اگر علی احمد اطلاع نہ کرتا تو جعفر شیرازی، بابا جوگی، ایزد عزیز اور دیگر احباب کو بھی اطلاع نہ ہوتی۔ بعدازاں اگلے روز صبح سویرے جعفر شیرازی، ریاض نغمی اور محمود علی محمود جھنگ پہنچے اور تدفین میں شرکت کی۔ بعداز تدفین فاتح خوانی میں شامل ہو کر واپس آئے باقی احباب نے سوئم میں شمولیت کی۔

ٹرک میں میت کیوں بھیجی گئی؟ ایمبولینس میں کیوں نہ گئی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اس زمانہ میں ایمبولینس اتنی عام نہ تھی۔ نہ ایدھی سروس تھی، نہ بزم رضا۔ ایک آدھ ہوتی تھی اور وہ ناکارہ یا کوئی اور ڈیوٹی دے رہی ہوتی۔ یہ باتیں آج کرنے کی نہیں ہیں۔

مجید امجد کے انتقال کے چند ماہ بعد ہم چند دوست جو ان دنوں گورنمنٹ کالج ساہیوال سے بی اے کر کے فارغ ہوئے تھے ان میں راقم الحروف راؤ شفیق احمد، زاہد حسین رانا، رضا صدیقی، ارشد رضوی، ایزد عزیز، ریاض نغمی، زاہد سید اور عبدالمجید نے مل کر ایک ادبی تنظیم ''مجلس فکرنو'' بنائی۔ اس مجلس کے تحت ہفتہ وار اجلاس ہوتا جس میں کسی نہ کسی شاعر کے ساتھ مجلس ہوتی، اُس کے کلام پر تنقید کی جاتی۔ کسی خصوصی موقع پر بڑا فنکشن کیا جاتا۔ چند ماہ بعد مجید امجد کی پہلی برسی بڑے اہتمام سے منائی گئی پورے پاکستان سے نامور شعراء تشریف لائے۔ صدارت جاوید احمد قریشی صاحب کی تھی۔ کیونکہ مجید امجد کی وفات کے اگلے دن اُن کے مکان سے اُن کا کلام اکٹھا کر لیا گیا خواجہ عسکری حسن اور جاوید قریشی کے مشورہ پر اُس کی

فہرست بنائی اور موقع پر موجود افراد جن میں قریشی صاحب، آغا امجد علی (پرنسپل گورنمنٹ کالج ساہیوال) ناصر شہزاد اور اُس وقت کے (ضلع صدر پاکستان پیپلز پارٹی) خواجہ عسکری حسن شامل تھے، کے دستخط کروا کر اُسے یو بی ایل کے لاکر میں رکھوا دیا گیا۔ وزیر اعلیٰ پنجاب محمد حنیف رامے نے ایک کمیٹی تشکیل دی اور مجید امجد کا تمام کلام مرتب کرنا اُس کمیٹی کے ذمہ لگایا۔

اسی وجہ سے ۱۱ مئی ۱۹۷۵ء کو پہلی برسی کی صدارت قریشی صاحب سے کروائی گئی آپ نے صدارتی خطبہ میں بغیر فلیپ کے کتاب لہرا کر شرکاء کو دکھائی اور کہا کہ کتاب کا نام "شب رفتہ کے بعد" تجویز ہوا۔ غلطیاں بہت ہیں اغلاط نامہ مرتب کر کے ساتھ لگایا جائیگا اور اگلے سال تک کتاب آپ کے زیر مطالعہ ہو گی۔ اس میں مجید امجد کا تین چوتھائی کلام موجود ہے۔ باقی اگلے برس تک ترتیب دے دیا جائے گا۔

دوسری برسی ۱۱ مئی ۱۹۷۶ء میں منعقد ہوئی جس کی صدارت جاوید احمد قریشی نے کی۔ قریشی صاحب نے کتاب مع فلیپ واغلاط نامہ سٹیج پر پیش کیا جس پر شرکائے محفل نے تالیاں بجا کر خوشی کا اظہار کیا۔ قریشی صاحب نے بقیہ کلام کے بارے میں بتایا کمیٹی کے ممبران دوسری مصروفیات کی وجہ سے کام نہیں کر سکے۔ عنقریب دوسرا حصہ آجائے گا۔ (جو آج تک نہیں آیا)۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ آپ اور ہم مجید امجد کی وفات پر اہل ساہیوال کو جن سے مجید امجد نے پیار کیا بُرا بھلا کہہ لیں اور اہل جھنگ سے تمغہ چھین لیں کہ مجید امجد وہاں کیوں پیدا ہوا تھا۔ کہ وہ کسمپرسی کے عالم میں برے حال واحوال میں مرگیا۔ کہہ لیں جو کہنا ہے۔ مگر اصل کام کی طرف بھی توجہ دیں "کلیات مجید امجد" مرتبہ خواجہ محمد زکریا کا پیش لفظ اسرار زیدی کی کتاب "بام و در، جن سے روشن ہوئے" میں مجید امجد کے کلام کے بارے جو چند نظموں اور غزلوں کا مسئلہ نہیں۔ مجید امجد کا بقایا کلام بہت زیادہ جو بنک کے لاکر میں رکھا گیا۔ لاکر سے نکلنے کے بعد وہ کہاں غائب ہوا اصل مسئلہ یہ ہے۔

قریشی صاحب نے مجید امجد کی دوسری برسی مئی ۱۹۷۶ء کے موقع پر جو کہ ریڈیو ملتان سے نشر ہوئی تھی میں کہا تھا کہ "مجید امجد کے کلام کا بقیہ حصہ شائع ہو جائے گا" اس کا ریکارڈ ریڈیو ملتان کے پاس موجود ہوگا۔ ۱۹۸۲ء میں "روز نامہ جنگ" کو انٹرویو دیتے ہوئے جاوید قریشی صاحب کمشنر فیصل آباد کی حیثیت سے خواجہ زکریا، حسن رضوی اور سعادت سعید کو مجید امجد صاحب کے کلام جن رجسٹروں میں موجود تھا تھمائے تھے۔ اُس وقت راقم الحروف نے روز نامہ جنگ میں ایک مراسلہ بھیجا تھا جو بعنوان "نعیم نقوی بنام جاوید قریشی" چھپا تھا۔ اُس میں یہ مطالبہ کیا تھا کہ مجید امجد صاحب کا بقیہ کلام بھی چھپوایا جائے اور مجید امجد کے ہاتھ سے تحریر کردہ رجسٹر بطور امانت محفوظ کرنے کیلئے گورنمنٹ کالج ساہیوال کے حوالے کیے جائیں۔ علاوہ ازیں عزیز واقارب اور دوستوں کے خطوط، شالاط کے خطوط، تصاویر اور مختلف تحریریں بھی جاری کی جائیں اور اُن کو محفوظ کیا جانا چاہیے۔ جو کہ بالکل غائب ہو گئیں اور نہ ہی ان کا کوئی تذکرہ ہے۔

رہی بات ساہیوال کی کہ مجید امجد کے انتقال کے ایک برس بعد ان کی بیوہ حمیدہ بیگم فرید ٹاؤن ساہیوال میں مجید امجد کے گھر کچھ عرصہ کیلئے آکر رہیں تو مجھے میرے خالہ زاد بھائی خواجہ عسکری حسن نے 1700/- روپے مجید امجد کی بیوہ کو پہنچانے کیلئے دیئے اور اُن سے رسید لانے کو کہا میں اور زاہد حسین رانا (صدر مجلس فکر نو) مجید امجد کے گھر گئے۔ مجید امجد کے پرانے ملازم احمد علی نے ہمیں بٹھایا۔ مجید امجد کی بیوہ جو کہ ایک ضعیف خاتون تھی اور سیدھے بُرقعے میں ملبوس تھیں کو بُلا کر ہمارے سامنے پلنگ پر بٹھایا میں نے انہیں 1700/- روپے جو کہ حکومت پنجاب نے چند ماہ پہلے مجید امجد کا وظیفہ 500/- روپے ماہوار اعلان کیا تھا اُن کو پہنچایا۔

اس کا اجمالی پہلو یہ ہے کہ اُس وقت کے وزیر اعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو شملہ معاہدہ کی غرض سے ہندوستان تشریف لے گئے۔ تو ہندوستان شعراء، دانشوروں، ادیبوں، اور صحافیوں کے ساتھ وزیر اعظم پاکستان کی ایک نشست رکھی گئی۔ اس نشست کے دوران کسی شاعر یا ادیب نے وزیر اعظم پاکستان سے مجید امجد کے بارے میں پوچھا۔ وزیر اعظم پاکستان نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا وہ ٹھیک ہیں اور خیریت سے ہیں خوش باش ہیں اور ساتھ ہی اپنے سیکرٹری کو اشارہ دیا کہ نوٹ کرلو۔ نشست کے بعد اپنے وفد کے ارکان سے وزیر اعظم پاکستان نے دریافت کیا کہ مجید امجد کون ہے؟ وفد کے کسی رکن نے انہیں بتایا "بڑے شاعر اور صاحب طرز بھی ہیں، ساہیوال میں گوشہ نشینی کی زندگی بسر کر رہے ہیں اور مشغول فن ہیں" وزیر اعظم پاکستان نے اپنے سیکرٹری کو پاکستان پہنچنے پر اس بارے میں یاد کروانے کا کہا پاکستان واپس آکر وزیر اعظم پاکستان کے حکم پر حکومت پنجاب نے مجید امجد کا وظیفہ مقرر کیا۔

یہ رقم مجید امجد کو اُن کی زندگی میں تو نہ مل سکی۔ لیکن انکی بیوہ کو پہنچائی گئی اور اُن سے رسید لی۔ مجید امجد کی بیوہ نے اہل ساہیوال کی تعریف کی اور اہل ساہیوال کی مجید امجد سے محبت کو سراہا اور کہا ''مجید امجد آپ کے شہر سے اور اس شہر کے لوگوں سے بہت پیار کرتے تھے اور آپ لوگوں نے اور آپ کے شہر نے انہیں بہت محبت دی۔'' کچھ عرصہ بعد مجید امجد کے بھائی عبدالکریم صاحب سے ملاقات ہوئی تو لگ بھگ انہوں نے بھی انہی خیالات کا اظہار کیا۔ یہ ملاقات اسٹیڈیم ہوٹل کے منیجر یعقوب، وارث انصاری اور ارشد رضوی کے ہمراہ اسٹیڈیم ہوٹل ساہیوال غالباً 1987 میں ہوئی تھی۔ عبدالکریم صاحب کے صاحبزادے اظہر کریم بھی تھے۔

ساہیوال میں ہر سال مجید امجد کیلئے پروگرام ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۹۹۲ء میں مجید امجد اکیڈمی بنائی گئی۔ ۱۹۹۲ء سے ۱۹۹۶ء تک پہلے صدر سابق وزیر تعلیم اور معروف افسانہ نگار غلام فرید کاٹھیا تھے اور راقم الحروف جنرل سیکرٹری اکرم ناصر، راؤ شفیق، عبدالرؤف عظمی، امین رضا، ایزد عزیز، مرتضیٰ ساجد، پروفیسر ریاض حسین زیدی پروفیسر اخلاق حسین عارف، پروفیسر ندیم عباس اشرف اور وارث انصاری، جیلانی شاہ، علی رضا، ذکریا خان سرگرم رہے۔ موجودہ صدر پروفیسر محمد اکبر شاہ صاحب اور جنرل سیکرٹری واصف سجاد ہیں۔ 1996 سے 2000 تک ایم اے اشرف (مرحوم) اکیڈمی کے جنرل سیکرٹری رہے، یہ امر اکیڈمی کے لیے باعث افتخار ہے کہ بشیر احمد بشیر، جعفر شیرازی، ناصر شہزاد، گوہر ہوشیار پوری اور سید شوکت ہاشمی مختلف ادوار میں صدر یا سینئر نائب صدر رہے۔ اُس دور میں بہت سی تقاریب منعقد ہوئیں اور مجید امجد پر تحقیقی کام جاری رہا۔ مجید امجد اکیڈمی نے کلام مجید امجد کی مختلف جہتوں پر کام کیا۔ اس سلسلے میں مجید امجد کے انتقال کے فوراً بعد کی ''نظموں'' پر گفتگو کا اہتمام ہر ماہ کیا جاتا ہے۔ اس گفتگو میں مجید امجد کے دوست نوجوان شعراء، ادیب، نقاد، اہل شہر شریک ہوتے ہیں اور یہ سلسلہ آج بھی جاری وساری ہے۔ مجید امجد کے کلام اُس کی تشہیر سے وابستہ مالی مفاد حاصل کرنے والوں میں ساہیوال کے احباب کبھی شامل نہیں رہے۔ یہ اعزاز تو صرف بڑے شہروں کے بڑے نقاد اور محقق حضرات کے حصے میں آیا اور انہیں ہی مبارک ہو۔

مجید امجد صاحب کے انتقال کے فوراً بعد تاج سعید (پشاور) نے اپنے مجلّہ (قند) میں مجید امجد نمبر شائع کیا اور گورنمنٹ کالج ساہیوال کے ادبی مجلّہ ''ساہیوال'' نے دوسرا مجید امجد نمبر چھاپا جو پرنسپل آغا امجد علی کے حکم پر پروفیسر ریاض حسین زیدی، ایزد عزیز جو کہ مجلّہ (ساہیوال) کی مجلس کے رکن تھے اور گورنمنٹ کالج کے سٹوڈنٹ تھے نے مرتب کیا۔ اس مجلّہ کا آغاز آغا امجد علی کے حکم سے مجید امجد کی زندگی ہی میں شروع ہوا۔ مگر اُن کے انتقال کے بعد اجراء ہوا۔ آج تک مجید امجد کے کلام پر بہت سی کتابیں مرتب ہو چکی ہے۔ اور تمام کی تمام اُن کی مرتبہ شائع شدہ کلام پر ہیں۔ کلیات مجید امجد کے دسیوں ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ مگر حیرت کی بات یہ ہے کہ اس کی رائلٹی کون لے جاتا ہے احباب نے کلام مجید امجد کو کاروبار اور ذریعہ معاش بنا لیا ہے۔ بہت کم ایسے دوست ہے جنہوں نے مجید امجد کی شاعری پر تنقیدی اور تحقیقی حوالے سے کام کیا جو لائق تحسین ہے اور یہ ہی اصل کام ہے نہ کہ اُن کی کسمپرسی کی موت کا دکھڑا رونا۔

ضلعی انتظامیہ کی بے حسی یا لاتعلقی کا عالم یہ ہے کہ ''بزم فکر و ادب'' جو کہ مجید امجد اور اُن کے ہمعصر احباب نے بنائی اور عرصہ دراز تک ادبی خدمات سر انجام دینے والا ادارہ قبضہ گروپس کے ہاتھوں عضوِ معطل بن کر رہ گیا ہے۔ اور عدالتوں میں قبضہ گروپ اور ضلع انتظامیہ کی بے عملی کا شکار ہے۔ مجید امجد پارک اور امجد آڈیٹوریم کی بلڈنگ قبضہ گروپ کے عدالتی Stay کے ذریعے روک دی گئی اور اسی گروپ نے اس پر قبضہ کر لیا۔ اور ضلع انتظامیہ اور ارباب اختیار اندیکھے مفادات یا مفاہمت کا شکار ہو کر خاموش ہیں۔ ''کسے وکیل کریں کس سے منصفی چاہیں'' کس سے مجید امجد کا بقایا کلام تحریریں، خطوط، تصاویر مانگیں۔۔۔ مگر تلاش اور تفتیش و تحقیق جاری رہے گی۔

حواشی

۱۔ ''شب رفتہ کے بعد''، جاوید قریشی، ارشد راج، ٹرپل سٹار پرنٹرز، ۱۹۷۶ء

''حرفِ معذرت''، جاوید احمد قریشی، ایضاً

''عرض مرتب'' عبدالرشید، ایضاً

۲۔ ''کلیات مجید امجد'' خواجہ محمد ذکریا، پروفیسر، ڈاکٹر، ماورا پبلشر لاہور، س ن

۳۔ ''بام و در جن سے روشن ہوئے''، اسرار زیدی، مقبول اکیڈمی لاہور، س ن

ہمارا موجودہ معاشرہ منٹو کی تحریروں کے آئینے میں

عائشہ عظیم

لرزتا ہے مرا دل زحمتِ مہرِ درخشاں پر
میں ہوں وہ قطرۂ شبنم کہ ہو خارِ بیاباں پر
(غالب)

سعادت حسن منٹو اردو ادب کا ایک بڑا نام ہے۔ منٹو کے فن کا کمال یہ ہے کہ اسے زندگی کے پیمانے پر ناپا اور پرکھا جا سکتا ہے۔ اس نے جن موضوعات پر قلم اٹھایا، معاشرے کے جن مسائل پر توجہ کی اور انسانی فطرت کے جن تاریک گوشوں کو نہ صرف معرضِ بیان میں لایا بلکہ قوتِ شدت اور ہمت و بے باکی کے ساتھ انھیں اپنے فن میں پیش کیا، وہ نہ صرف اس کے عہد کے بلکہ آج کے معاشرے کے بھی عکاس ہیں۔

منٹو اپنے انتقال کے طویل عرصے بعد بھی فنی اور فکری دونوں اعتبار سے ہمارے معاشرے سے ایک زندہ اور معنی خیز تعلق رکھتا ہے۔ موجودہ معاشرے کی ہولناک تیز رفتاری اور اس کے ساتھ انسانی زندگی میں بڑھتی ہوئی میکانکیت انسانیت کو ختم کرنے میں کمربستہ نظر آتی ہے۔ جو انسانوں سے غور کرنے کی عادت چھڑا کر انھیں روبوٹ بنانے اور محض وجودی زندگی بسر کرنے کا عادی میں کوشاں ہے۔ ایسے دور میں کسی ادیب کا اپنے فکری عناصر اور تخلیقی حوالوں کے ساتھ اپنی موت کے پچاس ساٹھ برس بعد بھی زندہ رہنا اس حقیقت کا بیّن ثبوت ہے کہ اس نے نہ صرف اپنے عہد کو بلکہ اپنے بعد کے عہد کو بھی سوچا تھا۔ منٹو نے اپنے فن میں ان مسائل اور موضوعات ہی سے سروکار رکھا جو حیاتِ انسانی میں دیرپا اہمیت کے حامل تھے۔

منٹو کا معاشرے سے جو ربط ہے اس کے بارے میں جاننے کے لئے ضروری ہے کہ ہم منٹو کی تحریروں اور اس کے فلسفے کو سمجھیں۔ اس کی تحریروں کی ایک بڑی خوبی حقیقت نگاری ہے، اس کا بنیادی موضوع انسانیت ہے۔ اس نے اپنی تحریروں کے ذریعے اعلیٰ انسانی اقدار کی عظمت کا نعرہ بلند کیا ہے۔ اس کی تحریریں جہاں فنی تکمیل کا نادر نمونہ ہیں وہاں ادب کی اس عالمی روایت کا حصہ بھی ہیں جو معاشرے کی ناہمواریوں کے خلاف جدوجہد کی داعی ہیں۔ منٹو اپنی تحریروں میں ان ذہنی، فکری اور جذباتی محرکات کو سامنے لایا جو نہ صرف اس کے بلکہ آنے والے دور کے معاشی، سماجی اور سیاسی حالات کے پس منظر میں اس کی سوچ کا محور تھے۔ اس نے اردگرد کے مسائل کو موضوع بنایا۔ اس کی تحریروں میں معاشرے کے اعلیٰ طبقے کے کردار نہیں، بلکہ اس کا موضوع معاشرے کا وہ طبقہ ہے جو اخلاق باختہ، پست فطرت اور اسفل کہلاتا ہے۔ بدی منٹو کا خاص موضوع ہے۔ اس کا مرکزی مسئلہ انسان کی تلاش ہے۔ اس کا مرکز گھٹن کا شکار یا گمراہ فطری انسان کے کئی روپ ہیں۔ اس کی پہلی شکل تو وہ ہے جس میں وہ گناہ اور گندگی میں ڈوبا ہوا ہے۔ طوائفیں، ان کے گاہک، عیاش مرد، بدکار عورتیں، یہ منٹو کے بیشتر کردار ہیں۔ فطری جبلتوں کو جب بندشوں سے روکا جاتا ہے تو وہ ان بندشوں کو توڑ دیتی ہیں جس سے زندگی میں افراتفری اور بے راہ روی پیدا ہوتی ہے۔ اخلاقی بندشوں نے انسان کو گناہ سے بچانے کے بجائے گناہ کی اتھاہ گہرائیوں کی طرف دھکیل دیا ہے، جس سے انسان گمراہ اور گناہ گار بن جاتا ہے۔ منٹو کا کمال یہ ہے کہ اس کی تحریروں میں برے سے برا انسان بھی جاگتا ہے۔

منٹو کی تحریروں میں موجودہ معاشرے کو تلاش کرنے کے لئے ضروری ہے کہ اس کے چند کرداروں کا ذکر کیا جائے۔ فاضل مصنف نے اپنے مشہور افسانے ''موذیل'' میں موذیل کا جو کردار پورٹرے کیا ہے وہ بظاہر ایک آوارہ اور بدچلن عورت کا کردار ہے لیکن وہ اپنے عاشق کی منگیتر کی زندگی بچانے کے لئے خود کو موت کی بھینٹ چڑھا دیتی ہے۔ ''ٹھنڈا گوشت'' میں ایشر سنگھ کے ساتھ مری ہوئی لڑکی کا جو واقعہ پیش آیا اس کا زبردست اور گہرا اثر ایشر سنگھ پر یہ ہوا کہ اس کے اندر کا حیوان مکمل طور پر سو گیا تھا اور اس میں سوئی ہوئی انسانیت بیدار ہو چکی تھی۔ اسی طرح ''بابو گوپی ناتھ'' کی زینت اور بابو گوپی ناتھ کو دیکھیے۔ زینت طوائف ہے اور بابو گوپی ناتھ عیاش آدمی۔ دونوں میں انسانی فطرت اپنی اصل شکل میں نہ صرف موجود ہے بلکہ زندہ بھی ہے۔ وہ طوائف ہونے کے باوجود مردوں کو لبھانا نہیں جانتی۔ اس کی، بے غرض اور ریاکاری سے پاک عورت کو بابو گوپی ناتھ پہچان لیتا ہے اس بات پر پریشان ہوتا ہے کہ جب اس کے پاس پیسے ختم ہو جائیں گے تو وہ زینت کو اپنی داشتہ بنا کر نہیں رکھ سکے گا۔ اس وقت یہ بھولی بھالی لڑکی اپنی زندگی کیسے گزارے گی۔ وہ اس کے لئے نہ صرف لڑکا تلاش کرتا ہے بلکہ سارا خرچ اٹھا کر اس کی شادی بھی

کرواتا ہے۔ منٹو کی تحریروں میں جابجا قابلِ ذکر کردار موجود ہیں جن میں انسان زندہ ہے۔ منٹو کے یہ کردار اس کے ذہن کی پیداوار اور تخیلی نہیں ہیں۔ بلکہ وہ معاشرے کی پیداوار ہیں۔

منٹو کی تحریریں اس بات کی عکاس ہیں کہ انسانوں کے مابین سماجی، اخلاقی، مذہبی، جذباتی اور خونی رشتے بلاشبہ ایک قوت رکھتے ہیں اور وہ انسانوں کے باہمی تعلقات پر اثر انداز بھی ہوتے ہیں۔ لیکن ایک انسان سے دوسرے انسان کا سب سے بڑا رشتہ انسانیت کا ہے اور اس رشتے سے مضبوط اور کوئی رشتہ نہیں ہے۔

منٹو اپنے ارد گرد کے جن مسائل کو زیر قلم لایا آج وہ سنگین صورت حال اختیار کر چکے ہیں۔ موجودہ معاشرے میں انسان کم سے کم مدت میں لاکھوں کمانے کی فکر میں ہیں۔ طمع، رشوت، چور بازاری، جھوٹ، فریب، مکاری، بے روزگاری جیسی لعنتیں معاشرے میں راہ پا چکی ہیں۔ جسکے نتیجے میں امیر، امیر سے امیر تر ہو رہا ہے اور غریب پر عرصہ حیات تنگ ہوتا چلا جا رہا ہے۔ غریب آدمی غربت کے ہاتھوں تنگ آ کر اپنے جگر گوشوں کو بیچ دینے پر مجبور ہے۔ منٹو کے ایک افسانے ''خودکشی کا اقدام'' کا کردار اقبال جب خودکشی کرنے میں ناکام رہتا ہے تو جج اس سے اس انتہائی قدم کی وجہ جاننا چاہتا ہے تو اقبال کہتا ہے:

''۔۔۔بیان! آپ کس قسم کا بیان لینا چاہتے ہیں؟ کیا میں سراپا بیان نہیں ہوں؟۔۔۔کیا میرے گالوں کی ابھری ہوئی ہڈیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ غربت کی دیمک میرے گوشت کو چاٹتی رہی ہیں؟۔۔۔کیا میری بے نور آنکھیں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ میری زندگی کی بیشتر راتیں لکڑی اور تیل کے دھوئیں کے اندر گزری ہیں؟۔۔۔کیا میرا سوکھا ہوا جسم یہ بیان نہیں دے رہا کہ اس نے کڑے سے کڑا دکھ برداشت کیا ہے؟ کیا میری زرد بے جان اور کانپتی ہوئی انگلیاں یہ بیان نہیں دے رہیں کہ وہ سازِ حیات کے تاروں میں امید افزا نغمہ پیدا کرنے میں ناکام رہی ہیں؟''

لمحہ فکریہ ہے کہ آج کے نوجوان روزگار نہ ملنے کی وجہ بے راہ روی کا شکار ہو رہے ہیں۔ اخبارات اٹھا کر دیکھ لیں حالات سے تنگ آ کر لوگ خودکشی کر لینے کی خبر ہمارے اخبارات کا لازمی حصہ بن چکی ہے۔ منٹو کے زمانے میں گجرات میں گینگ ریپ کا ایک واقعہ ہوا۔ وہ اس موضوع پر کہانی لکھنا چاہتا تھا لیکن حساس طبیعت ذکا اس موضوع پر نہ لکھ سکا۔ اسی طرح گینگ ریپ، بدفعلی، کاروکاری اور ونی کی رسم جیسی غلاظتیں ہمارے معاشرے میں تیزی سے پھیل رہی ہیں۔ عالمی شہرت پانے والی مختاراں مائی اس کا ایک ثبوت ہے جو پنچایتی فیصلے کی بھینٹ چڑھی۔ اسی طرح کم سن بچے بچیوں کے ساتھ بدفعلی اور زیادتی کے بعد انہیں مار دینا درندگی کی ایک اور مثال ہے آج کے معاشرے کا انسان دراصل ایک مردہ انسان ہے۔ جبکہ منٹو کا انسان اپنی تمام تر خباثتوں اور غلاظتوں کے باوجود انسانیت رکھتا ہے۔ منٹو کی تحریریں سفاکی اور بے باکی، ہنگامہ خیزی، وحشت ناکی اور بے راہ روی کے مراحل سے ہوتی ہوئی جس معنویت کو اجاگر کرتی ہیں، وہ انسانیت کی اثباتی اقدار اور انسان پر اس کے اعتبار کا اعلامیہ ہے۔ جبکہ موجودہ معاشرے کا انسان مثبت اقدار سے محروم ہو رہا ہے۔

منٹو اپنے انتقال کے اتنے عرصے بعد بھی ہمارے ادب کا زندہ حوالہ ہے۔ ہمارے سماجی ڈھانچے اور تہذیبی و اخلاقی نظام سے اس کا تعلق آج بھی قائم ہے۔ سوال یہ ہے کہ آج اگر منٹو زندہ ہوتا تو کیا کرتا؟؟؟ ہوسکتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں کوئی بابو گوپی ناتھ، ایشر سنگھ اور موذیل موجود ہو لیکن انھیں دریافت کون کرے گا؟؟؟ منٹو نے انسان کے جسمانی، روحانی، نفسیاتی مسائل کا حل بھی بتایا ہے مگر آج کل صرف مسائل ہیں جن کا حل کسی کے پاس نہیں۔ آج بھی ہمارے معاشرے کو منٹو کی ضرورت ہے، جو صرف اخباروں، رسالوں اور خبروں میں دکھائی جانے والی درندگی اور درماندگی کے واقعات کی نشان دہی کرتے ہوئے صرف بحث و مباحثہ نہ کرے بلکہ اس کا حل بھی سامنے لائے۔ آج ایسے قلم کار کی ضرورت ہے جس کا قلم دو دھاری ہو جو ایک طرف تو معاشرے کے مسائل بیان کرے اور دوسری دھار ان مسائل کو کاٹتی جائے۔

حواشی

۱۔ علی ثنا بخاری، ڈاکٹر، سعادت حسن منٹو (تحقیق)، منٹو اکادمی لاہور، طبع اول، مئی ۲۰۰۶ء

۲۔ مبین مرزا، سعادت حسن منٹو: شخصیت اور فن، اکادمی ادبیات پاکستان، ۲۰۰۸ء

۳۔ محمد سعید، نوادرات منٹو، ادارہ فروغ مطالعہ، لاہور، ۲۰۰۹ء

۴۔ ممتاز شیریں، منٹو: نوری نہ ناری، مکتبہ اسلوب کراچی، ۱۹۸۵ء

۵۔ توصیف اختر، منٹو کے افسانوں میں معاشرتی مسائل، مقالہ ایم اے، پنجاب یونیورسٹی، لاہور، ۱۹۷۲ء

بحرِ جمیل مثمن سالم

وجاہت مسعود

مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن

اس بحر کے متعلق کافی ابہام ہے ۔حافظ محمود شیرانی بقول شمس قیس رازی لکھتے ہیں:

''رودکی نے دو بیت (متقارب مقبوض اثلم) میں لکھے ہیں، جو تبع کے لانے سے ثقیل معلوم نہیں ہوتے

گل بہاری بت تتاری ،نبیذ داری چرا نیاری نبیذ روشن چو ابر بہمن بجز دگلشن چرا نیاری (ص ۱۵۰ طبع یورپ)

اس اطلاع کی بناپر میں نے اس کا نام رودکی رکھ دیا ہے''(۱)

بقول محقق طوسی:

''چنانچہ بنا در لغت پارسی رکن ثمانی یافتہ نشود مولف از دو وتد و سبب بروزن مفاعلاتن و شعر دیدہ ام از تکرار این رکن چار بار کہ عین آن شعر بریاد ندارم اما بر ایں منوال بودہ: بیت اگر بدانی کہ بے تو چو غم مرا دریں غم روانداری''(۲)

ترجمہ: لغت فارسی میں ایک رکن ثمانی (آٹھ حرفی) ملتا ہے۔جو دو وتد اور ایک سبب خفیف بروزن مفاعلاتن ہے ۔وہ شعر یاد نہیں ،لیکن کچھ اس طرح کا تھا۔

مولوی نجم الغنی اسے بے نام بحر کہتے ہیں :'' تیسری بحر مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن'' دو بار ہے ۔اس کے رکن سالم میں آٹھ حروف ہیں''م'ف'ا'ع'ل'ا'

'ت'ن۔''مگر اس بحر کا کوئی نام نہیں رکھا گیا ہے۔حقیقت میں یہ وزن رجز مثمن مخبون مرفل یا کامل مثمن موقوص مرفل ہے۔''(۳)بقول حبیب اللہ غضنفر'':مرغوب

۱۶ ارکنی فعول فعلن آٹھ بار''(۴)صوفی وارثی میرٹھی نے لکھا ہے:''بحر صوفیہ: مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن''(۵) رتن پنڈوری رقم طراز ہیں:''بحر کا وزن

مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن دو بار ہے اس بحر کا کوئی نام نہیں رکھا گیا البتہ حضرت قوی امروہوی نے اس کا نام گمنام تجویز کیا ہے اور سفیر سخن کے مصنف نے اسے غریق کے نام سے پکارا ہے''(۶)یعقوب آسی :''ہماری فہرست میں ایک رکن مفاعلاتن ہے جو وزن میں فعول فعلن یا فعل فعولن کے برابر ہے۔بنیادی رکن فاعلاتن میں جو بحر رمل کا رکن ہے شروع میں ایک حرکت کا اضافہ کرنے سے مفاعلاتن (م + فاعلاتن) حاصل ہوتا ہے'

اس طرح بحر مرغوب کو بحر رمل سے براہ راست اخذ کیا جا سکتا ہے۔''(۷)سامر کھتری نے ماہنامہ''خاتون مشرق''۲۰۰۷ء میں اس کا نام بحر سامر لکھا ہے۔

اس بحر کو بحر رودکی، بے نام بحر، گمنام بحر،غریق ،مرغوب ،صوفیہ اور بحر سامر کے نام سے پکارا گیا ہے،لیکن اس نے اصل شہرت بحرِ جمیل کے نام سے پائی ہے ۔جب کمال احمد صدیقی نے اپنی کتاب''آہنگ اور عروض''اور کندن لال کندن نے ''ارمغان عروض''اور ''معراج فن''میں اس کا نام جمیل لکھا ہے۔

اس بحر میں پہلا شعر رودکی نے ،رکن مفاعلاتن کا پہلا ذکر محقق طوسی نے کیا ہے۔بحر جمیل کا نام کمال احمد صدیقی نے دیا ہے اور کندن لال کندن نے دائرہ طوسی کے نام سے دائرہ بنا کر تین بحور استخراج کی ہیں ۔جن میں ایک مستعمل اور دو متروک ہیں۔

جس طرح اس بحر کے نام میں مسائل ہیں۔ اسی طرح اس کی تقطیع میں بھی مسائل ہیں۔یہ وزن دیگر بھی کئی بحروں سے نکل سکتا ہے۔جس کا ذکر کئی عروضیوں نے کیا ہے۔کندن لال کندن نے حبیب اللہ غضنفر کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے:

''موصوف نے ذوق کا ایک شعر بحر (مرغوب)ثلم متقارب ۱۶ ارکنی ''فعول فعلن'' کے تحت دیا ہے:

زمیں پہ نو رقمر کے گرنے''میں'' صاف اظہار روشنی ہے کہ جو ہیں روشن ضمیر ان کو فروغ ان کی فروتنی ہے۔بحر متقارب میں کوئی ایسی بحر نہیں موصوف نے صحیح بحر کے تعین میں ٹھوکر کھائی ہے۔ثلم صدر وابتدا کا زحاف ہے حشو میں آ ہی نہیں سکتا''(۸)

کمال احمد صدیقی نے علامہ اقبال کے ایک شعر کا ذکر شمس الرحمٰن فاروقی کے حوالے سے کیا ہے بقول کمال احمد صدیقی:

''میں ظلمت شب میں لے کے نکلوں گا اپنے درماندہ کارواں کو شرر فشاں ہوگی آہ میری' نفس نفس شعلہ بار ہوگا

شمس الرحمٰن فاروقی نے''عروض آہنگ اور بیان''میں (ص۱۱۴)ان مصرعوں کی تقطیع یوں کی ہے

فَعَل فعولن فَعَل فعولن فَعَل فعولن۔فَعَل فاروقی نے صحیح مقام پر نہیں رکھا ہے ۔اس ساری ترتیب میں یہ مزاحف چاروں جگہ نادرست ہے ۔اگرچہ تولنے میں ارکان اور الفاظ ہم وزن ٹھہرتے ہیں' لیکن از روئے عروض یہ غیر حقیقی تقطیع ہے۔''(۹)

حافظ محمود شیرانی ایسی بحور کے متعلق رقم طراز ہیں:

''عروضیوں کے پاس ان لم قد بے اشعار کے تولنے کے لئے چونکہ چھوٹے باٹ ہیں،وہ ان کو اصل ارکان کا مضاحف مان کر شانزدہ رکنی کے نام سے یاد

کرتے ہیں اور چھوٹے پیمانوں سے تقطیع کرتے ہیں مثلاً فاع 'فعولن یا فعول 'فعْلن 'فعْلن فَعِلن وغیرہ ظاہر ہے کہ لٹھے کا تھان گرہوں کے بجائے گزوں سے زیادہ سہولت کے ساتھ جلد ناپا جاسکتا ہے ۔اس لیے لمبے شعر کے لیے لمبے اوزان یقیناً زیادہ مناسب ہیں''(۱۰)

صابر کلوروی متقارب مثمن اثلم کے متعلق لکھتے ہیں:

''راقم الحروف کے خیال میں اس بحر کی تقطیع ان ارکان سے ہونی چاہیے ۔مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن: اس سے تقطیع کا عمل زیادہ آسان ہوسکتا ہے۔''(۱۱)

شمس والرحمن فاروقی :''اب یہ ہے کہ تقطیع ایسی ہو جس میں کم زحاف کا سہارا لینا پڑے''(۱۲)

کندن لال کندن نے بحر جمیل کا ذکر کرتے ہوئے اس کے کئی غیر حقیقی آہنگوں کا ذکر کیا ہے بقول کندن لال کندن:

۱۔رجز مسدس مزاحف مفاعلن فاعلن فعولن مخبوں مرفوع مخلع ۲۔ بحر منتقب مسدس مخبوں مرفوع سالم مخلع ۳۔ بحر متقضب مثمن مضاعف

فعول فعلن فعول فعلن مطوی مرفوع مسکن ۔۔۔ ۴۔بحر بسیط مسدس مخبوں سالم مخلع مفاعلن فاعلن فعولن ۵۔بحر سریع مسدس مخبوں مرفوع

مکشوف مفاعلن فاعلن فعولن ۶۔بحر مجتث مسدس مخبوں مکفوف محذوف مسکن مفاع لن فاع لات فعلن ۔۔۔۔۔ ۷۔بحر حسیر مثنی سباعی؛

مقبوض،سالم محذوف مفاعلن فاع لن فعولن ۸۔بحر مثیل مسدس مثنی خماسی مقبوض،سالم،سالم فعول مس تفع لن فعولن میں بھی تقطیع ہوتے ہیں۔ دائرہ منعکسہ مسدسہ بحور صریم حمید اور صغیر کی مزاحف بحور میں بھی تقطیع ہوتے ہیں ۔اب سوال اٹھتا ہے کہ جب ایک غزل اتنی بحور میں غوطہ زنی کرتی ہے تو اسے کس بحر میں جگہ دینی چاہیے تاکہ گمراہ ہونے سے بچا جاسکے اور بحث طویل سے بھی اس کا حل علم عروض میں ہے۔جو کلام کم زحافات میں تقطیع ہو اس بحر میں لینا چاہئے ،اگر کلام کسی مفرد بحر میں تقطیع ہو تو اس بحر میں لینا چاہئے ۔اگر کلام مفرد بحر میں تقطیع ہوسکتا ہے تو اسے مرکب بحر میں جگہ نہیں دینی چاہئے۔(۱۳)

زیادہ عروضیوں نے اس وزن کی تقطیع متقارب اثلم شانزدہ رکنی میں کی ہے۔شانزدہ رکنی میں شعر کہنا اردو مزاج نہیں ہے۔اردو میں عموماً مثمن سے زیادہ استعمال نہیں ہوتیں۔ بحر جمیل کا مزاج عربی ہے اور اردو علم عروض کی بنیاد عربی پر ہے۔ جس بحر کی تقطیع عربی مزاج کے مطابق ہو جائے اس کی تقطیع ہندی مزاج کے مطابق نہیں کرنی چاہیے ۔عربی عروض ایک مخصوص قاعدے کلیے پر قائم ہے۔ ہندی پنگل کی مقام پر ایک اندازے اور موزونیت پر چلتا ہے کسی منظم اصول کے تحت نہیں۔ایسے شعر کی تقطیع متقارب کے ہندی مزاج کے وزن فعل فعولن یا فعول فعلن سے کی جاسکتی ہے متقارب سے ''فعول فعلن'' حاصل کرنے کے لیے زحاف قبض او ثلم کا استعمال کیا جاتا ہے اور فعل فعولن'' سے تقطیع کرنے کے لیے اثرم زحاف کا استعمال کیا ہے ۔جو ثلم اور قبض کا مرکب ہے۔ثلم اور اثرم زحاف کی تعریف میں کہا گیا ہے کہ یہ دونوں زحاف صدر و ابتدا سے مخصوص ہیں ۔جن عروضیوں نے ثلم اور اثرم کو ہر جگہ جائز رکھا ۔ان کی تقطیع غیر حقیقی تقطیع کے زمرے میں آئے گی ۔عربی عروض میں یہ وزن بحر بسیط مخبون سالم مخبون مقطوع یا مخلع مفاعلن فاعلن فعولن اور بحر منسرح مخبون ،مطوی خذذ مفاعلن فاعلات فعلن بھی کی جاسکتی ہے ۔یہ فروع عروض عرب سے بھی عروضی قواعد و ضوابط کے تحت استخراج نہیں کی جاسکتیں ۔کئی بحور کا کندن لال کندن نے بھی ذکر کیا ہے ۔اگر ان بحور میں تقطیع کی جائے تو ان میں بعض بحور میں تقطیع غیر حقیقی تقطیع کے زمرے میں آئے گی اور بعض بحور غلط تقطیع کے زمرے میں آئیں گی ۔اگر کسی دیگر بحر سے اس کے اوزان عروضی قواعد و ضوابط کے تحت بھی نکل آئیں تو پھر بھی اُن میں تقطیع نہیں کرنی چاہیے ۔ وہاں زحاف لگانے پڑیں گے اور بحر جمیل میں بغیر زحاف لگائے تقطیع ہو جاتی ہے۔اس لیے بحر جمیل میں تقطیع کرنی چاہیے۔ بحر جمیل کا آہنگ بڑا دلکش ہے۔

۱۔اس رکن کے موجد محقق طوسی ہیں اور محقق طوسی کو فارس میں وہ مقام حاصل ہے جو عرب میں خلیل بن احمد کو تھا۔محقق اپنے زمانے کے بہت بڑے مفکر، فلاسفر اور عروضی تھے ۔انھوں عروض کے علاوہ جن موضوعات پر قلم اٹھایا۔ان میں محقق طوسی کی شہرت زیادہ ہے ۔وہ عالم تھے اور عالم ہمیشہ دلیل سے بات کرتا ہے۔

۲۔خلیل نے مفرد بحروں کو وتد مجموع سے شروع کیا ہے کیونکہ وتد مجموع میں موسیقی زیادہ ہوتی ہے۔ یہ بحر بھی وتد مجموع سے شروع ہوتی ہے اور یہ واحد بحر ہے، جس کے شروع میں دو وتد مجموع آتے ہیں ۔جس سے اس آہنگ کا دلکش محسوس ہوتا ہے۔

۳۔بعض کہتے ہیں کہ یہ آٹھ حرفی ہے اور اردو میں کوئی بھی آٹھ رکنی بحر مروج نہیں لیکن شرط حروف نہیں موزونیت ہونی چاہیے۔سات حرفی بحور وافر اور کامل کے مقابلے میں بے شک ظاہری طور پر اس کے سانچے بڑے لگتے ہیں،لیکن تکنیکی طور پر چھوٹے ہیں۔بحر وافر اور کامل میں فاصلہ یا سبب ثقیل آتے ہیں۔ جو الفاظ اردو زبان میں موجود نہیں لیکن اس بحر میں صرف وتد مجموع اور سبب خفیف آتے ہیں ۔جو اردو زبان میں بے شمار الفاظ ہیں، اس لیے یہ اردو زبان کے زیادہ قریب ہے۔

بہار آئی، چلو چمن میں، ہوا کے اوپر بھی رنگ آیا

کہاں تلک گل نہ ہوئے غنچہ، رہا مندے منہ سونگ آیا (میر تقی میر) (غزلیات میر تقی میر ص۲۰۱)

مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن

بہار آئی چلو چمن سے ہوا کے اوپر سب رنگ آیا
کہا تنک گل ان ہو غن چا رہا م دے من س تنگ آیا

فارسی میں یہ وزن امیر خسرو ،مولوی جامی عصمت اللہ بخاری ،اور بیدل کے ہاں ملا ہے۔امیر خسرو کا کلام اس وزن میں بہت مشہور ہوا ہے۔ ہندی میں یشودا چھند کے چاروں چرنوں کو ملا کر ایک چرن بنالیا جائے اور اس کے ماترائی روپ کو جس میں بتیس ماترائیں ہوں گی اور یہ وزن تقریباً بحر جمیل مثمن سالم کے برابر بنتا ہے۔اردو اور پنجابی میں بھی استعمال ہوتا ہے۔

جمیل مثمن سالم مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن فارسی زحال مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں کہ تاب ہجراں ندارم اے جاں نہ لیہو کاہے لگائے چھتیاں (امیر خسرو)

ہندی کھلا یہ کہتے ہیں آج اب ہم سوراجیہ لیں گے
سوراجیہ لیں گے کریں گے آواز اب نہ مدھم سوراجیہ
لیں گے سوراجیہ لیں گے (راشٹریہ وینا)(ڈاکٹر مسیح اللہ اشرفی ص ۲۱۴،۲۱۳)

اردو زمانہ آیا ہے بے حجابی کا، عام دیدار یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا، وہ راز اب آشکار ہوگا
(علامہ اقبال)(کلیات اقبال ص ۹۶)

پنجابی دعا میں کرناں امید میری دا ہونہ
جاوے غروب سورج جواب تیرے دے منتظر نیں
اجے تے میرے سوال کافی (شاکر پچھیانوی) \
(حرفاں ہتھ مہاراں ص ۱۲۸)

بحر جمیل کے دیگر اوزان

۲۔جمیل بارہ رکنی مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن
مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن

میں جانتا تھا گھنے گھنے جنگلوں کے سینوں میں دفن ہے جو متاع غم وہ کسی طرح بھی نہ لاسکوں گا میں پورے دن کی چتا جلا کر چلا ہوں گھر کو کہ جیسے سورج کے پیٹ میں ٹوٹتی ہوئی آخری کرن ہوں (راجیندر بالی)(حرف معتبر ص ۳۱)

۳۔جمیل معشر سالم مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن
مفاعلاتن مفاعلاتن

یہ چار شامیں جو معتبری فضا میں ہم نے گزار لیں ہیں تو یہ غنیمت اب اس سے آگے جو منتظر اک چراغ آثار راستہ ہے وہ تو نہیں ہے (نوشی گیلانی)(محبتیں جب شمار کرنا ص ۴۳)

۴۔جمیل مسدس سالم مفاعلاتن مفاعلاتن مفاعلاتن۔
جدید شعراء میں نوشی گیلانی اور قمر رضا شہزاد کا اس وزن میں بڑا اعشار یہ ہے۔

مجھے پہنچنا ہے منزلوں پر مگن ہے اتنی قدم اُٹھانا ہے مجھ کو مشکل تھکن ہے اتنی (منیر نیازی)
(کلیات منیر ص ۸۲۵)

۵۔جمیل مسدس مقلوع مفاعلاتن مفاعلاتن فعولن
ہوا کو اپنے خلاف میں کر رہا ہوں
چراغ کا اعتراف میں کر رہا ہوں
(قمر رضا شہزاد) (پیاس بھرا مشکیزہ ص ۹۳)

۶۔جمیل مسدس مخمق مقلوع محذوف مفاعلاتن
مفاعلاتن فع جو بلبلوں کی صدا نہیں آتی
چمن سے بوئے وفا نہیں آتی (الطاف عاطف)
(جمیل کا چاند ص ۹۹)

۷۔جمیل مربع سالم مفاعلاتن مفاعلاتن
یہی خوشی ،یہی مشقت
سدا خوشی ،سدا مشقت
(محمد صفدر میر)(جلد پنجم ص ۲۰۲)

۸۔جمیل مربع سالم مقصور مفاعلاتن مفاعلان
یہ پیار کا جام تیرے نام
یہ آج کی شام تیرے نام (وجاہت تبسم)

۹۔جمیل مربع اخرم سالم فاعلاتن مفاعلاتن
بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے (فیض احمد فیض)
(نسخہ ہائے وفا ص ۴۷)

حوالہ جات:

۱۔ حافظ محمود شیرانی ،مرتبہ مظہر محمود شیرانی ،مقالات شیرانی ،جلد ہفتم :ص ۲۸۸
۲۔مظفر علی اسیر ،زر کامل عیار ، ترجمہ معیار الاشعار، اتر پردیش ،اردو اکادمی ،۱۹۸۳ء :ص ۲۱۹، ۲۲۰
۳۔مولوی نجم الغنی ،بحر الفصاحت ، لاہور، مجلس ترقی ادب ،بار دوئم ،دسمبر ۲۰۰۶ء :ص ۴۵
۴۔پروفیسر حبیب اللہ خان غضنفر ،اردو کا عروض، پاکستان، غضنفر اکیڈمی ،بار سوئم ،۲۰۰۵ء :ص ۵۸
۵۔حضرت علامہ صوفی وارثی میرٹھی ،شعر و قافیہ ،بار چہارم ،س ن ،ص ۶۹
۶۔پنڈت رتن پنڈوری ،سرمایہ بلاغت ،دہلی، انصاری مارکیٹ ،دریائے گنج ،۱۹۸۳ء :ص ۴۵۷
۷۔یعقوب آسی ،فاعلات ،لاہور ،دوست ایسوی ایٹس ،۱۹۹۳ء :ص ۸۴، ۸۵
۸۔کندن لال کندن ،معراج فن ،نئی دہلی ،نیو باپوری، راجپت نگر ،۲۰۱۱ء :ص ۶۸
۹۔کمال احمد صدیقی ،عروض سب کے لیے ،لاہور، سیونتھ سکائی پبلی کیشنز ،۲۰۱۲ء :ص ۱۵۶، ۱۵۷
۱۰۔حافظ محمود شیرانی ،مرتبہ مظہر محمود شیرانی ،مقالات شیرانی ،جلد ہفتم :ص ۲۸۲
۱۱۔صابر کلوروی ،عروض بدیع ،لاہور ،علمی کتب خانہ، ۱۹۸۴ء :ص ۱۱۷
۱۲۔شمس الرحمن فاروقی ،عروض آہنگ اور بیان ،دہلی، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان ،بار دوئم، ۲۰۰۴ء :ص ۲۷۵
۱۳۔کندن لال کندن ،معراج فن :ص ۵۹، ۶۰، ۶۱

علی رضا......ایک ہمہ جہت شخصیت

ذکاء اللہ انجم ملغانی

علی رضا سے میرا تعلق تقریباً پچیس سال سے ہے۔ ساہیوال میں ملازمت کے سلسلے میں جانا ہوا ہے تو سب سے پہلے ان کے حلقۂ احباب میں شامل ہونے کا اعزاز حاصل ہوا۔ میں نے شعر و ادب اور ادبی تقریبات کے حوالے سے ان سے زیادہ متحرک شخص اور کسی کو نہیں دیکھا۔ ساہیوال کی وجہ شہرت مجید امجد ہیں مگر ساہیوال کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے جعفر شیرازی، حاجی بشیر احمد بشیر، پروفیسر ریاض حسین زیدی اور علی رضا جیسی نابغۂ روزگار ادبی شخصیات کو جنم دیا۔ علی رضا شاعر بھی ہے، کالم نگار بھی، نعت گو بھی اور خوش الحان نعت خواں بھی ہیں۔ انہوں نے شعر و ادب کے شعبے کو متعدد گرانقدر تخلیقات سے نوازا ہے جن میں ان کا شعری مجموعہ مفہوم، نعتیہ مجموعہ ثنائے سرورؐ، نعتیہ انتخاب درود انؐ پر سلام انؐ پر، انتخاب سلام ہمارے ہیں حسین، مرد خود آگاہ......سید تجمل عباس، شخصی خاکے، کالم اور مضامین شامل ہیں۔۔۔ ثنائے سرورؐ کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ اس نعتیہ مجموعے کو بیک وقت صوبائی اور قومی سیرت ایوارڈ مل چکے ہیں۔ قومی سیرت ایوارڈ انہوں نے صدر مملکت سے وصول کیا۔

درود انؐ پر سلام انؐ پر، کو 1999 میں محکمہ تعلیم پنجاب نے تمام لائبریریوں کی زینت بنانے کی منظوری دی ہے جبکہ اس انتخاب کا دوسرا ایڈیشن بھی زیر طبع ہے۔ فن نعت خوانی میں علی رضا کا نام بین الاقوامی اہمیت کا حامل ہے اور انہیں اس سلسلے میں بحرین میں بین الاقوامی ایوارڈ بھی دیا گیا۔

گورنمنٹ کالج یونیورسٹی فیصل آباد میں ایم فل کی سطح پر علی رضا کی ادبی خدمات کے حوالے سے کام بھی ہو رہا ہے۔ ان کا دوسرا نعتیہ شعری مجموعہ بھی طباعت کے مراحل سے گزر رہا ہے۔ علی رضا کا کلام مدتوں سے فنون، اوراق اور دیگر معیاری ادبی جریدوں میں شائع ہوتا رہا جب کہ قومی اخبارات اور رسائل میں شائع ہونے والے ان کے مضامین اور کالموں کو بھی کتابی شکل دی جا رہی ہے ان کی تازہ ترین نعت سے کچھ اشعار نذر قارئین ہیں۔

اس در پاک پہ دعا کے بغیر
نعت ہوتی نہیں عطا کے بغیر
آسماں، آسماں نہیں لگتا
وسعت جلوہ حرا کے بغیر
حبس جاں میں اترنے لگتا ہے
آپؐ کے شہر کی ہوا کے بغیر

علی رضا اردو ادب کی اہم صنف غزل کے معتبر اور نمائندہ شاعر ہیں ان کی غزل کے تین اشعار پیش خدمت ہیں

کچھ خواب ہیں آنکھوں سے نکالے نہیں جاتے
آنسو نکل آتے ہیں سنبھالے نہیں جاتے
سورج کی طرح روز نکلتا ہے وہ گھر سے
اب شہر کی گلیوں سے اجالے نہیں جاتے
نرگس کہیں، سنبل کہیں، شبنم کہیں، مہتاب
شعروں سے ترے یار حوالے نہیں جاتے

ایک اور غزل کا شعر ہے۔۔

مرا یوں ہر گھڑی مصروف رہنا
کسی کو بھول جانے کے لئے ہے
اور لوگ کیا کیا جہان چھوڑ گئے
کب کسی کا رہا نشان کوئی

ان کا کلام معروف گلوکاروں نے گا کر امر کر دیا ہے مثال کے طور پر غلام عباس کی گائی ہوئی یہ غزل

بجھتے ہوئے شعلے کو ہوا دیتا ہے آکر
ہر روز نیا درد جگا دیتا ہے آکر
سچا ہے بلا کا وہ چھپاتا نہیں کچھ بھی
ہر بات جو دل میں ہو بتا دیتا ہے آکر

غلام عباس ہی کی گائی ہوئی ایک اور غزل کے اشعار پیش ہیں۔۔۔

آنکھوں کو تھا جو ذوق تماشہ نہیں رہا
دل بجھ گیا ہے کوئی تقاضا نہیں رہا
یہ سانحہ بھی کم تو نہیں ہے کہ تیرے بعد
کوئی بھی تیرے شہر میں اپنا نہیں رہا

غزل کی گائیکی کے مشہور گلوکار اعجاز قیصر نے علی رضا کی غزل کو گایا تو اسے ملکی اور بین الاقوامی سطح پر بھرپور پزیرائی ملی۔ غزل کے تین اشعار دیکھیں۔

لمحے ہجر وصال کے
رکھنا یار سنبھال کے
اپنے اپنے رنگ ہیں
ہر اک صاحب حال کے
بے مصرف ہے زندگی
اس کی یاد کو ٹال کے
کام آنے کی چیز ہے
رکھنا درد سنبھال کے

علی رضا کو اپنی والدہ سے بہت پیار تھا۔ والدہ کے انتقال کے بعد انہوں نے ماں کے حوالے سے تین سو کے قریب اشعار کہے ہیں۔۔۔

ماں کے قدموں کو چومنے کا عمل
کس بلندی پہ لے گیا ہے مجھے
اور کہتے ہیں کہ روز قیامت کا رضا
ماں کا جانا بھی قیامت سے کوئی کم تو نہیں
سرحد غم پہ کھڑا سوچ رہا ہوں کب سے
ماں کے ہوتے ہوئے خوشیوں کا ٹھکانہ نہیں تھا
ماں کی جدائی بھی مجھے تنہا نہ کر سکی
اشکوں کا اک ہجوم مرے ساتھ ساتھ ہے

آخر میں ان کی غزل کے دو خوبصورت اشعار پیش خدمت ہیں۔۔۔

بنتی ہی رہے بات ضروری تو نہیں ہے
ہر شام ملاقات ضروری تو نہیں ہے
کل صورت حالات ہو کیسی کسے معلوم
یہ صورت حالات ضروری تو نہیں ہے

روماجی

عامر بن علی/ جاپان

پہلے پہل روماجی کا لفظ سن کر تاجی، باؤجی اور اسی طرح کے دیگر فلمی خیالات میرے ذہن میں آئے تھے۔ یہ تو بعد میں عقدہ کھلا کہ یہ معاملہ فلمی نہیں علمی نوعیت کا ہے۔ پاکستان چونکہ تاج برطانیہ کی عملداری سے آزاد ہوا اسی لئے ہمارے ہاں رومن رسم الخط میں لکھی گئی ہر تحریر کو انگریزی کہہ کر معاملہ ختم کردیا جاتا ہے۔ جاپان میں صورت حال ذرا مختلف ہے۔ یہاں انگریزی دیگر یورپی زبانوں کی طرح فقط ایک غیر ملکی زبان کا درجہ رکھتی ہے۔ لہٰذا یہاں رومن رسم الخط میں لکھی ہر تحریر کو انگریزی نہیں کہا جاتا، بلکہ رومن حروف تہجی اور عبارت ''روماجی'' کہلاتی ہے۔

جاپان میں مقیم غیر ملکی تارکین وطن کے لئے ''روماجی'' کی اہمیت بہت زیادہ ہے۔ اس کی غیر موجودگی میں تو بیرونی ممالک سے آکر جاپان میں بسنے والے پردیسیوں کی غالب اکثریت ان پڑھ کہلائے گی۔ گرچہ جاپانی رسم الخط تین طرح کے ہیں مگر تینوں ایک سے بڑھ کر ایک مشکل ہے۔ سب سے جان لیوا تو چین سے کئی صدیاں پہلے درآمد کردہ رسم الخط ''کھانجی'' ہے، جو کہ بنیادی طور پر تصاویری ہے۔ ان تصاویر کی تعداد کی کوئی حد مقرر نہیں ہے۔ اب ایسے بے شمار حروف تہجی کی موجودگی میں بھلا کوئی غیر ملکی کہاں تک سیکھے۔ دیگر دو رسم الخط ''ہیراگانا'' اور ''کھاتاکانا'' کہلاتے ہیں، جن کی تعداد باون، باون ہے۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہاں ہر تحریر ان تینوں رسم الخطوط کو ملا کر ہی لکھی جاتی ہے۔ لہٰذا نستعلیق جاپانی پڑھنے کے لئے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے۔

گو کہ انگریزی نے اپنی اہمیت کو جیسے باقی دنیا میں منوایا ہے ویسے ہی جاپانی بھی اس کی اہمیت کو تسلیم کرتے ہیں۔ بچوں کو سرکاری و نجی سکولوں میں لازمی مضمون کے طور پر پڑھانے کے لئے انگریزی اہل زبان اساتذہ کو بھاری مشاہرے پر جاپان بلوایا جاتا ہے، مگر سالہا سال کی سرتوڑ کوششوں کے باوجود یہ منصوبہ ناکام دکھائی دیتا ہے۔ اگرچہ بہت ساری جاپانی خواتین انگریزی سیکھنے کی سرتوڑ کوشش میں غیر ملکی مردوں کے ساتھ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو چکی ہیں۔ مگر انگریزی کا چلن اس ملک میں نہیں ہو سکا۔ امریکہ کے زیر نگیں ریاست پورٹوریکو سے آئی ایک انگریزی کی استانی نے مجھے بتایا کہ جاپانی بچوں کو انگریزی سکھانا ناممکن ہے۔ وہ تو اس قدر جھنجلائی ہوئی تھی کہ جاپانی نسل کے تمام نو نہالوں کو ہی ''ناممکن'' قرار دینے پر تلی ہوئی تھی۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ انگریزی کی اہمیت تسلیم کرنے کے باوجود جاپانیوں کا انگریزی زبان میں ہاتھ خاصا تنگ ہے۔ مجھ سے اگر کوئی اس تنگ دامنی کا سبب پوچھے تو مختصر ترین الفاظ میں اس کی وجہ یہ ہے کہ ''جاپان بہت جاپانی ہے''۔ بیرونی دنیا کے اثرات اس خطہ ارض تک بہت کم پہنچے ہیں، ماضی قریب میں تین صدیوں تک ملک کی سرحدیں مکمل طور پر بند رہیں۔ اس کے نتیجے میں دنیا سے الگ تھلگ جزیروں کے جھرمٹ پر مشتمل اس ملک پر غیر ملکی اثرات بھی بہت ہی محدود ہو گئے۔ ان تین صدیوں کی تنہائی، جسے امریکہ بہادر نے زبردستی 1854ء میں جنگ کی دھمکی دیکر ختم کیا تھا، اس عالمی تنہائی کے اثرات لوگوں کی نفسیات، رویوں اور ہر شعبہ زندگی میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

آپ حیران ہوں گے کہ کچھ سال پہلے تک پورے جاپان میں ریلوے اسٹیشنوں اور سڑکوں کے ناموں سے لے کر ہر سرکاری و غیر سرکاری بورڈ صرف جاپانی زبان میں ہی تحریر ہوتا تھا۔ جب سے سیاحت کے فروغ کے لئے یہ قانون پاس ہوا ہے کہ سرکاری بورڈوں پر روماجی یعنی رومی رسم الخط میں بھی عبارت تحریر کی جائے تب سے غیر ملکیوں کے لئے بڑی آسانی پیدا ہو گئی ہے۔ ورنہ تارکین وطن اپنی گلی، محلے کے نام کا بورڈ تک نہیں پڑھ سکتے تھے۔ ریل کا اسٹیشن بھی پردیسی لوگ اندازے سے ہی اتر جاتے تھے، اور یہ اندازہ ہمیشہ ٹھیک بھی نہیں ہوتا تھا۔ کبھی گھر سے ایک اسٹیشن آگے نکل جاتے تو کبھی دو اسٹیشن پہلے ہی گاڑی سے اتر جاتے تھے۔

یہاں پر رومن رسم الخط اور زبان کی وضاحت برمحل ہوگی۔ قدیم سلطنتِ روم کی زبان بذاتِ خود تو ناپید ہوتی جارہی ہے، مگر اس زبان کا رسم الخط پوری دنیا میں رواج پا گیا ہے۔ ویٹی کن سٹی میں پاپائے اعظم اور ان کے قریبی رفقاء اب بھی اپنا رسمی خطبہ لاطینی زبان میں دیتے ہیں۔ اس کی وجہ شاید قدیم عیسائی روایت ہے۔ کیونکہ حضرت عیسیٰؑ کے عہد میں یروشلم اور عرب کا زیادہ تر حصہ قدیمی رومی سلطنت کے زیر تسلط تھا۔ ابن مریمؑ کو مصلوب بھی روما کی سلطنت کے نمائندے کے حکم پر کیا گیا تھا۔ یہ الگ معجزہ ہے، اس واقعے کے کچھ سال بعد رومن شاہی خاندان نے خود عیسائیت قبول کر لی۔ تب سے اٹلی عیسائی مذہب کے سب سے بڑے فرقے رومن کیتھولک کا مرکز ہے۔ قدیم روما کی زبان لاطینی سے چار بڑی یورپی زبانوں کا جنم ہوا۔ ان میں پرتگالی، ہسپانوی، اطالوی اور رومانوی شامل ہیں۔ لاطینی امریکہ کے خطے کو اسی لسانی بنیاد پر یہ نام دیا گیا ہے، چونکہ وہاں ہسپانوی اور پرتگالی زبانیں بولی جاتی ہیں، دلچسپ بات یہ ہے کہ لاطینی امریکہ کوئی جغرافیائی خطہ نہیں ہے بلکہ یہ براعظم شمالی وجنوبی امریکہ کے وہ ممالک ہیں جہاں لاطینی زبان سے اخذ کردہ زبانیں بولی جاتی ہیں۔ جاپان میں گزشتہ چند سالوں کے دوران رومن رسم الخط نے بڑی تیزی سے رواج پایا ہے۔ ترویج تو رومن اردو رسم الخط کی پاکستان میں بھی بہت زیادہ تیزی سے ہوئی اور ہو رہی ہے، مگر ہمارے ہاں تو یہ موبائل فون ٹیکسٹ اور سوشل میڈیا کی مقبولیت کے باعث ہو رہا ہے۔ یہاں صورتحال اور اسباب مختلف ہیں۔ سبب چاہے جو بھی ہو مگر جب سے روماجی کا چلن عام ہوا ہے، غیر ملکیوں کی جاپان میں زندگی بہت آسان ہوگئی ہے۔

اظہر عنایتی / بھارت

راستو! کیا ہوئے وہ لوگ جو آتے جاتے
میرے آداب پہ کہتے تھے کہ جیتے رہیے

میسر ہو جو لمحہ دیکھنے کو
کتابوں میں ہے کیا کیا دیکھنے کو
ہزاروں قد آدم آئنے ہیں
مگر ترسو گے چہرہ دیکھنے کو
ابھی ہیں کچھ پرانی یادگاریں
تم آنا شہر میرا دیکھنے کو
پھر اس کے بعد تھا خاموش پانی
کہ لوگ آئے تھے دریا دیکھنے کو

ہو گیا اپنی ہی انا سے ہلاک
دب گیا اپنی ہی چٹان سے میں
ایک رنگین سی بغاوت پر
کٹ گیا سارے خاندان سے میں
روز باتوں کے تیر چھوڑتا ہوں
اپنے اجداد کی کمان سے میں
مانگتا ہوں کبھی لرز کے دُعا
کبھی لڑتا ہوں آسمان سے میں

میری آواز پہ رُکنے والو!
جاؤ، میں خود کو صدا دیتا ہوں
اتنے دیکھے ہیں سنہرے سپنے
سب کو تعبیر بتا دیتا ہوں
لوگ بازار میں لے آتے ہیں
میں جو تصویر بنا دیتا ہوں
خالی ہاتھوں سے ندامت ہے اگر
میں تجھے سنگ اُٹھا دیتا ہوں
کچھ مزاج اس کا بھی جذباتی ہے
میں بھی کچھ بات بڑھا دیتا ہوں

کتابیں جب کوئی پڑھتا نہیں تھا
فضا میں شور بھی اتنا نہیں تھا
عجب سنجیدگی تھی شہر بھر میں
کہ پاگل بھی کوئی ہنستا نہیں تھا
بہت معصوم سی اپنائیت تھی
وہ مجھ سے روز جب ملتا نہیں تھا
جوانوں میں تصادم کے لیے رُکتا
قبیلے میں کوئی بوڑھا نہیں تھا
پرانے عہد میں بھی دشمنی تھی
مگر ماحول زہریلا نہیں تھا
کبھی کچھ تھا غزل میں اُس کی اظہر
بس اک لہجہ مرے جیسا نہیں تھا

قیامت آئے گی مانا یہ حادثہ ہوگا
مگر چھپا ہوا منظر تو رونما ہوگا
ابھی فضا میں تھی اک تیز روشنی کی لکیر
نہ جانے ٹوٹ کے تارا کہاں گرا ہوگا
عزیز مجھ سے تھا انعام میرے سر کا اُسے
رئیس ایک ہی شب میں رہ گیا ہو گیا
ہوئی جو بات تو وہ عام آدمی نکلا
گمان تھا کہ نئے رُخ سے سوچتا ہوگا
رہے گا سامنے کب تک یہ نیلگوں منظر
یہ آسمان کہیں ختم تو ہوا ہوگا
عجب سفر ہے مجھے بھی پتا نہیں اظہر
کہ اگلے موڑ پہ کردار میرا کیا ہوگا

وہ مجھ سے میرا تعارف کرانے آیا تھا
ابھی گزر جو گیا ایک عظیم لمحہ تھا
سنا ہے میں نے یہاں سرخ گھاس اُگتی تھی
وہ بادشاہ یہیں اپنی جنگ ہارا تھا
ہماری رات سے بہتر تھی اگلے وقت کی رات
ہر ایک گھر میں دیا صبح تک تو جلتا تھا
عزیز مجھ کو بھی تھے نقش اپنے ماضی کے
اُسے بھی شوق پرانی عمارتوں کا تھا
اب اپنے سر کا تحفظ بھی آپ خود کیجیے
فضا میں آپ نے پتھر بھی خود اچھالا تھا

جانے آیا تھا کیوں مکان سے میں
کیا خریدوں گا اس دکان سے میں

خطرۂ جاں سے بچا دیتا ہوں
پنچھیوں کو میں اُڑا دیتا ہوں

باقی احمد پوری/لاہور

(تازہ شعری مجموعے "والہانہ" سے منتخب غزلیں)

اُڑتے نہیں ہیں، اُڑاتے ہوئے پرندے ہیں
ہمیں نہ چھیڑ ستائے ہوئے پرندے ہیں
قفس میں قید کرو یا ہمارے پر کاٹو
تمہارے جال میں آئے ہوئے پرندے ہیں
ہوا چلے گی تو بچے اُڑائیں گے ان کو
یہ کاغذوں سے بنائے ہوئے پرندے ہیں
جے ہوئے ہیں یہ شاخوں پہ اس طرح جیسے
شجر کے ساتھ اُگائے ہوئے پرندے ہیں
فلک پہ جن کو ستارے سمجھ رہے ہیں لوگ
وہ چاندنی میں نہائے ہوئے پرندے ہیں
بلندیاں ہیں ہمارے مزاج میں شامل
بلندیوں سے گرائے ہوئے پرندے ہیں
ہمارے پاس ہی آئیں گے لوٹ کر باقی
ہمارے جتنے سدھائے ہوئے پرندے ہیں

وہ ستم کر کے پشیماں نہیں ہونے والا
سخت کافر ہے مسلماں نہیں ہونے والا
ایک دن کھینچ کے لانا ہی پڑے گا اُس کو
یوں علاجِ غمِ ہجراں نہیں ہونے والا
اک دیا شہر میں جلتا ہے اگر تو کیا ہے
اک دیے سے تو چراغاں نہیں ہونے والا
تنگ آیا ہوں بہت عشق وجنوں کے ہاتھوں
اور اب چاک گریباں نہیں ہونے والا
بھول جانے کی میں کوشش تو کروں گا لیکن
کام مشکل ہے یہ آساں نہیں ہونے والا
تیرے آتے ہی بہاریں بھی چلی آئیں گی
ورنہ یہ دشت گلستاں نہیں ہونے والا
داغ دل اپنا ستاروں کی طرح ہے باقی
رات سے پہلے نمایاں نہیں ہونے والا

کسی میں دم نہیں اتنا، سرِ شہرِ ستم نکلے
ضمیروں کی صدا پر بھی، نہ تم نکلے نہ ہم نکلے
کرم کی ایک صورت یہ بھی ہو سکتی ہے مقتل میں
تری تلوار بھی چلتی رہے اور خوں بھی کم نکلے
نہ میں واعظ، نہ میں زاہد، مریضِ عشق ہوں ساقی
مجھے کیا عذر پینے میں، اگر سینے سے غم نکلے
محبت میں یہ دل آزاریاں اچھی نہیں ہوتیں
جسے دیکھو تری محفل سے وہ با چشمِ نم نکلے
ستاروں سے پرے کوئی ہمیں آواز دیتا ہے
کہیں ایسا نہ ہو سائیں وہاں سے بھی صنم نکلے
یہاں تو بغض ونفرت کے علمبردار ہیں سارے
یہاں کیسے کوئی لے کر محبت کا علم نکلے
اُدھر پھیلے ہوئے تھے دور تک لشکر یزیدوں کے
اِدھر دو چار ہم جیسے ہمارے ہم قدم نکلے
میں سمجھتا تھا کہ وہ خوش ہے مگر جب غور سے دیکھا
وہی دکھ درد تھے سارے وہی رنج و الم نکلے
مری ہر بات پر ہنستے ہوئے کہتے ہیں وہ باقی
ترا ارمان تو شاید کبھی اگلے جنم نکلے

سب کہاں اہل تخت ہوتے ہیں
بخت والوں کے بخت ہوتے ہیں
وہ پرندوں کو دُکھ نہیں دیتے
جو تناور درخت ہوتے ہیں
اپنی بنیاد سے جو کٹ جائیں
وہ سدا لخت لخت ہوتے ہیں
پتھروں سے جڑے ہوئے شیشے
پتھروں سے بھی سخت ہوتے ہیں
وہ کسی دل میں گھر نہیں کرتے
جن کے لہجے کرخت ہوتے ہیں
فقر سے آشنا جو ہو جائیں
ان کی ٹھوکر پہ تخت ہوتے ہیں
جب سفر آخرت کا ہو باقی
پھر کہاں ساز و رخت ہوتے ہیں

جام کی بات چلی، ذکر سبو کا نکلا
تیری آنکھوں میں تو منظر لب جو کا نکلا
اپنے بارے میں کوئی بات بتاتا ہی نہیں
یہ ستارا بھی کسی عالم ہو کا نکلا
مدتوں بعد کہاں ڈھونڈتے پھرتے ہو مجھے
میں تو اس شہر کی گلیوں سے کبھو کا نکلا
ہر کوئی میری طرف تیغ بکف آتا ہے
ہر کوئی پیاسا یہاں میرے لہو کا نکلا
حرص نے جال بچھائے ہیں جہاں میں کیا کیا
کوئی دولت کا، کوئی نام کا بھوکا نکلا
دل نہ برباد کیا میں نے جنوں کی حد تک
زخم کھایا نہ کوئی کام رفو کا نکلا
اُس کے ہونے سے بہاریں تھیں چمن میں باقی
اُس کے جاتے ہی وہ موسم بھی نمو کا نکلا

احمد عطاء اللہ

اس لیے پھول کو سزا دی ہے
اُڑ کے مہمان تک چلا گیا تھا

آتی جاتی یہ لہر خوش ہو جائے
پاؤں ڈالو تو نہر خوش ہو جائے
میں پڑوں پیلا یا کہ نیلا پڑوں
تیری باتوں کا زہر خوش ہو جائے
اس لیے بھی جدا ہوا ہوں میں
تو، ترا شہر خوش ہو جائے
اس کا بندہ ہوں میں رہوں نہ رہوں
خوش ہوں اُس کا جو قہر خوش ہو جائے

اس سوا سال کی معافی ہو
میں پرستان تک چلا گیا تھا
اک پری کو خدا سمجھ بیٹھا
میرا ایمان تک چلا گیا تھا
ہجر کشمیر تک چلا گیا تھا
وصل ملتان تک چلا گیا تھا
اس لیے پھول کو سزا دی ہے
اُڑ کے مہمان تک چلا گیا تھا
مڑ کے دیکھا تو ایک دوست کا ہاتھ
اپنی کرپان تک چلا گیا تھا
تجھ کو ترکِ تعلقات معاف
عشق نقصان تک چلا گیا تھا

کب سیانوں سے چل سکی دُنیا
اب دوانوں سے بات چل رہی ہے

بس اُگا ئیں گے تیرے رنگ کے پھول
ان کسانوں سے بات چل رہی ہے
گاؤں نے راہ روک رکھی ہے
کچھ مکانوں سے بات چل رہی ہے
ایک کشتی کی تلخ لہجے میں
بادبانوں سے بات چل رہی ہے
دل میں یا گھر میں خوش رہیں گے عطاؔ
بے ٹھکانوں سے بات چل رہی ہے
گاؤں کے ٹمٹماتے تاروں میں

حسن قندیل لگ رہا ہے مجھے
ان پرندوں کا پیڑ پر ہونا
تیری تقبیل لگ رہا ہے مجھے
ایک تتلی نے تجھ کو چوما ہے
ہاتھ پر نیل لگ رہا ہے مجھے
آ کہ میں دستخط کروں بوسہ
شعر تفصیل لگ رہا ہے مجھے
لے مرا ہاتھ تھام، آ ڈوبیں
آسماں جھیل لگ رہا ہے مجھے
یہ جو قابیل تجھ کو لگتا ہے
یہ بھی ہابیل لگ رہا ہے مجھے

ہم غریبوں کا سائباں نہ جلا
شک کی تیلی سے آسماں نہ جلا
گھر میں لے جا کے نذرِ آتش کر
یوں رقیبوں کے درمیاں نہ جلا
رنگ انڈیل مت کبھی خود پر
میرے کھیتوں کا زعفراں نہ جلا
ہے مسلسل بخار جیسا عشق
تو میری آگ سے زباں نہ جلا
مت جرابیں اُتار رستے میں
سنگ مرمر کی سیڑھیاں نہ جلا

بہت قریب کا زندہ خیال دیتا ہوں
وفا کے ذکر میں اپنی مثال دیتا ہوں
میں اس کو بھیجتا رہتا ہوں تازہ سرخ گلاب
بھڑکتی آنکھ کو اور اشتعال دیتا ہوں
وہ آج بھی نہیں آیا سو اس کے حصے کے
یہ سرخ پھول میں دریا میں ڈال دیتا ہوں
وہ پہلی بار ندی سے نہا کے نکلی ہے
میں اس کو باہوں کی پشمینہ شال دیتا ہوں
ابھی عطاؔ میرا دنیا پہ بس نہیں چلتا
تو بے وفاؤں کو دل سے نکال دیتا ہوں

کنول ملک/دبئی

(تازہ شعری مجموعے "تمہارے نام" سے منتخب شاعری)

لہو رونا پڑا تو پھر؟
مجھے کھونا پڑا تو پھر؟
ہے مشکل بے وفا ہونا
اگر ہونا پڑا تو پھر؟
تھکن سے چور ہیں آنکھیں
اگر سونا پڑا تو پھر؟
کسی دشتِ طلب میں جب
سفر بونا پڑا تو پھر؟
محبت ہجر میں پتھر
تمہیں ڈھونا پڑا تو پھر؟
ابھی چاروں طرف ہو تم
کبھی کونا پڑا تو پھر؟

کوئی تم سے جدا ہونے لگا تو پھر؟
غمِ ہجراں عطا ہونے لگا تو پھر؟
ابھی تو ہم سوالی ہیں ترے غم کے
جو تو دستِ دعا ہونے لگا تو پھر؟
کرو گے کیا جو ہم مغرور ہو جائیں
جو تو ہم پر فدا ہونے لگا تو پھر؟
اندھیری رات کا دکھ جان لیوا ہے
دیا ہی جب ہوا ہونے لگا تو پھر؟
ابھی رُخ پر اُداسی خوب لگتی ہے
یہ غم جب انتہا ہونے لگا تو پھر؟
کنولؔ مشغول ہے اس کی عبادت میں
یہ سجدہ جب قضا ہونے لگا تو پھر؟

گفتگو اچھی لگی لہجہ بڑا اچھا لگا
پرکشش سا اجنبی چہرہ بڑا اچھا لگا
اس کی باتوں میں ملائم ریشمی احساس تھا
جانے کیوں مجھ کو ہر اک جملہ بڑا اچھا لگا
دھڑکنیں بھی تیز تھیں شاید وہ سن بھی نہ سکا
قربتوں کی اوٹ میں اک فاصلہ اچھا لگا
اجنبی سا ہم سفر جانے وہ کیوں اپنا لگا
جب دکھا اپنا لگا وہ جب ملا اچھا لگا
اس کی باتوں سے بکھرتے لفظ سارے پھول تھے
اس کے لہجے کی تھکاوٹ کا نشہ اچھا لگا
گفتگو میں دفعتاً وہ بے تکلف ہو گیا
آپ کہتے کہتے اس نے تم کہا، اچھا لگا
وہ سراپا ناز تھا ماہِ دسمبر کی طرح
اس کی گہری چپ بھی اس کا بولنا اچھا لگا
بارہا سوچا کہ چلتی چلتی گھڑیاں تھام لوں
دیر تک پہلو میں اس کے بیٹھنا اچھا لگا
مجھ کو بس اک سانحے نے پاس اس کے کر دیا
بارہا ہوتا رہے وہ سانحہ اچھا لگا
کوئی بھی قیمت چکا دوں اس کی قربت کے لیے
جس کی قربت کے لیے اک حادثہ اچھا لگا
ہم سفر ایسا تھا کہ سارا سفر اچھا لگا
ساتھ اس کے ہر نگر ہر راستہ اچھا لگا
وہ میرے اُلجھے سوالوں کو بھی سلجھاتا رہا
بارہا اس راہنما سے پوچھنا اچھا لگا
اس کی باتوں میں کچھ ایسے ڈوبنا کہ ڈوب کر
اپنے ہی گھر کی گلی کو بھولنا اچھا لگا

کچھ دنوں سے ایک مشکل مرحلے میں ہوں مگر
مجھ کو جانے کیوں وہ مشکل مرحلہ اچھا لگا
وہ گیا تو اک عجب احساس باقی رہ گیا
دیر تک چہروں اسی کو سوچنا اچھا لگا
جاگتی آنکھوں میں اس کا خواب لے کے صبح تک
کروٹوں میں بے کلی سے جاگنا اچھا لگا
وہ سماعت میں میری رس گھولتا ہی رہ گیا
جب بھی میرا نام اس نے لے لیا اچھا لگا
نام اپنا اس کے ہونٹوں سے سنا جب جب کنولؔ
دھڑکنوں کا رابطہ یک دم ٹوٹنا اچھا لگا

کسی کی پیاس نے اتنا کہا کنول پانی
تو میری آنکھ سے آیا اُچھل اُچھل پانی
تو کیا میں ہونٹ ہی رکھ دوں سلگتے ہونٹوں پر
تو کیا سوال کی مشکل کرے گا حل پانی
مرے وجود پہ نیلے نشاں ہیں لہروں کے
سو میرے ساتھ کہیں ہو نہ جائے شل پانی
میں جانتی ہوں جزیرے میں کوئی اپنا ہے
میں چل رہی ہوں مرے ساتھ ساتھ چل پانی
ترے بھنور کے بھلے بیچ جان لیوا ہیں
میں جل رہی ہوں مرے ساتھ ساتھ جل پانی
اب اس سے بڑھ کے مری پیاس کی کہانی کیا
ہے ابتدا مری پانی سے تو اجل پانی
میں اس سے کہنے لگی تھی میں آج پیاسی ہوں
وہ مجھ سے کہنے لگا تھا ملے گا کل پانی
کہوں میں کیا کہ رویہ ہی اس کا ایسا تھا
میں ایک پل میں تھی مٹی اور ایک پل پانی

علینا عترت / بھارت

(تازہ شعری مجموعے "سورج تم جاؤ" سے منتخب شاعری)

شام کے وقت چراغوں سے جلائی ہوئی میں
گھپ اندھیروں کی منڈیروں پہ سجائی ہوئی میں
دیکھنے والوں کی نظروں کو لگوں سادہ ورق
تیری تحریر میں ہوں ایسے چھپائی ہوئی میں
خاک کر کے مجھے صحرا میں اُڑانے والے
دیکھ رقصاں ہوں سر دشت اُڑائی ہوئی میں
کیا اندھیروں کی حفاظت کے لیے رکھی ہوں
اپنی دہلیز پہ خود آپ جلائی ہوئی میں
لوگ افسانہ سمجھ کر مجھے سنتے ہی رہے
درحقیقت ہوں حقیقت سے بنائی ہوئی میں

زندہ رہنے کی یہ ترکیب نکالی میں نے
اپنے ہونے کی خبر سب سے چھپالی میں نے
جب زمیں ریت کی مانند سرکتی پائی
آسماں تھام لیا جان بچا لی میں نے
اپنے سورج کی تمازت کا بھرم رکھنے کو
نرم چھاؤں میں کڑی دھوپ ملا لی میں نے
مرحلہ کوئی جدائی کا جو درپیش ہوا
تو تبسم کی ردا غم کو اوڑھا لی میں نے
ایک لمحے کو تری سمت سے اُٹھا بادل
اور بارش کی سی اُمید لگا لی میں نے
بعد مدت مجھے نیند آئی بڑے چین کی نیند
خاک جب اوڑھ لی جب خاک بچھالی میں نے
جو علینا نے سر عرش دعا بھیجی تھی
اس کی تاثیر یہیں فرش پہ پا لی میں نے

خزاں کی زردی رنگت بدل بھی سکتی ہے
بہار آنے کی صورت نکل بھی سکتی ہے
جلا کے شمع اب اُٹھ اُٹھ کے دیکھنا چھوڑو
وہ ذمے داری سے از خود پگھل بھی سکتی ہے
ہے شرط صبح کے رستے سے ہو کے شام آئے
تو رات اس کو سحر میں بدل بھی سکتی ہے
ذرا سنبھل کے جلانا عقیدتوں کے چراغ
بھڑک نہ پائیں کہ مسند یہ جل بھی سکتی ہے
ابھی تو چاک پہ جاری ہے رقص مٹی کا
ابھی کمہار کی نیت بدل بھی سکتی ہے
یہ آفتاب سے کہہ دو کہ فاصلہ رکھے
تپش سے برف کی دیوار گل بھی سکتی ہے
ترے نہ آنے کی تشریح کچھ ضروری نہیں
کہ تیرے آتے ہی دنیا بدل بھی سکتی ہے
کوئی ضروری نہیں وہ ہی دل کو شاد کرے
علینا آپ طبیعت بہل بھی سکتی ہے

اجنبی سا اک ستارہ ہوں میں سیاروں کے بیچ
اک جدا کردار ہوں اپنے ہی کرداروں کے بیچ
پھر رہی ہوں بے سبب پاگل ہوا سی جابجا
دُھند میں لپٹے ہوئے خاموش کہساروں کے بیچ
اس حصار خاک کو جب توڑ کر نکلوں گی میں
ڈھونڈتے رہ جاؤ گے تم مجھ کو دیواروں کے بیچ
شکل یہ بہتر ہے لیکن پختگی کے واسطے
آؤ مٹی کو رکھیں کچھ دیر انگاروں کے بیچ

کچھ کڑے ٹکراؤ دے جاتے ہیں اکثر روشنی
جوں چمک اُٹھتی ہے کوئی برق تلواروں کے بیچ
کون دے گا خشک پتوں کے سوالوں کا جواب
اجنبی کیوں ہو گئے ہم اپنے گلزاروں کے بیچ

ہر اک ورق میں نمایاں ہر ایک باب میں ہم
تھے حاشیے کی طرح پھر بھی اس کتاب میں ہم
جواب ہم تھے ہمارے لیے جواب نہ تھے
سوال میں تو تھے شامل، نہ تھے جواب میں ہم
کوئی ملا ہی نہیں جس سے حال دل کہتے
ملا تو رہ گئے لفظوں کے انتخاب میں ہم
کسی نے خواب میں دیکھا ہمیں تو خواب کیا
کہ عمر بھر کو ہوئے قید ایک خواب میں ہم
عیاں تھے جذبۂ دل اور بیاں تھے سارے خیال
کوئی بھی پردہ نہ تھا جب کہ تھے حجاب میں ہم
علینا تجربے ہیں تلخ اس کے مکتب کے
تو اور امتحاں دیں گے نہ اس نصاب میں ہم

موسم گل پر خزاں کا زور چل جاتا ہے کیوں
ہر حسیں منظر بہت جلدی بدل جاتا ہے کیوں
یوں اندھیرے میں دکھا کر روشنی کی اک جھلک
میری مٹھی سے ہر اک جگنو نکل جاتا ہے کیوں
روشنی کا اک مسافر تھک کے گھر آتا ہے جب
تو اندھیرا میرے سورج کو نگل جاتا ہے کیوں
تیرے لفظوں کی تپش سے کیوں سلگ اُٹھتی ہے جاں
سرد مہری سے بھی تیری دل یہ جل جاتا ہے کیوں

گل جہان/راول پنڈی

(تازہ شعری مجموعے "لاوجود" سے منتخب شاعری)

بات کو شعر کریں لفظ میں جادو باندھیں
مصرعۂ تر میں خیالات کے آہو باندھیں
تب کہیں جا کے وہ مہتاب نظر آئے گا
ہم سلیقے سے اگر رات کے گیسو باندھیں
کیا خبر تتلیاں اس طور سے ہاتھ آجائیں
اپنی مٹھی میں کسی پھول کی خوشبو باندھیں
اب یہاں رزق کی تقسیم مساوات پہ ہو
اب نئی طرز پہ ہم اُس کی ترازو باندھیں
تاکہ اُس چہرۂ سیماب پہ ٹھہراؤ رہے
ہم کسی شعر میں اس حُسن کے ابرو باندھیں
چیخ کے سوز میں کچھ ساز کی آمیزش ہو
کیوں نہ ہم درد کے پیروں میں بھی گھنگھرو باندھیں
چپکے چپکے یہ چراغوں کا گلا گھونٹتی ہے
صبح لائی ہے تو گل رات کے بازو باندھیں

اداسی کا سفر اچھا نہیں ہے
کہ اس میں سمت ہے رستہ نہیں ہے
مگر اس کو سبھی پہچانتے ہیں
محبت کا کوئی چہرہ نہیں ہے
یہ کس کندھے پہ ہم نے ہاتھ رکھا
بھروسے کا سفر کتنا نہیں ہے
یقیں کی دھوپ پر ہے بے یقینی
شجر لاکھوں مگر سایہ نہیں ہے
میں ہوتے ہوتے صحرا ہو گیا ہوں
کہیں امید کا ذرہ نہیں ہے

نکل کر خود سے دیکھوں تیری دنیا
بدن کا طاقچہ کھلتا نہیں ہے
زمیں سے آسماں کا کوئی رشتہ
اگر ہے بھی تو پھر سچا نہیں ہے
میں گل کیسے چھپاؤں ننگِ آدم
کہیں احساس کا بُرقہ نہیں ہے

خاموشیاں دم توڑ گئیں بارِ سُخن سے
آواز کے دو قطرے گرے میرے دہن سے
اک روز کبوتر مرے شانے پہ جو اُترا
پھر شاخیں نکل آئیں مرے سوکھے بدن سے
تصویر جلائی تو امڈ آئے تھے آنسو
منظر کی چتا جلتی رہی گیلی جلن سے
نیندوں سے مرا بیر کہاں عارضی نکلا
بستر کی ہوئی موت مری کہنہ تھکن سے
اے تیرہ بدن چھوڑ بھی دے کارِ ہوس کو
ہر بار ملا ہوں میں ترے میلے کفن سے
دنیا میرے کردار کی تاویل میں روئی
میں اپنی کہانی کو نکل آیا عدن سے
ہے میرا تعلق بھی اسی فرقے سے گل جی
راحت جسے ملتی ہے محبت کی چبھن سے

باہر کی حد پھلانگ کے اندر دکھائی دے
اتنے قریب سے مجھے منظر دکھائی دے
ذرے کے بطن سے ملے صحرا کے خد و خال
قطرے کی وسعتوں میں سمندر دکھائی دے

پھر بے یقیں وہ حل کے ترازو میں تل گیا
جب مسئلے کی زد میں قلندر دکھائی دے
حیرت لیے میں آئینے کے رو برو ہوا
اندر ہے جو مرے مجھے باہر دکھائی دے
لازم وہاں ہے ضبط کا لہجہ ہی سرخرو
شیشہ جہاں مزاج میں پتھر دکھائی دے
میں مسندِ انا پہ ہوا جب براجمان
ہر شخص اپنی ذات کا محور دکھائی دے
لایا ہے تیرا عشق مجھے اس مقام پر
سایا جہاں وجود سے بہتر دکھائی دے
اس کی انا کہ جسم سے رہتا ہے ماورا
آنکھیں بضد کہ اب کوئی پیکر دکھائی دے

محبت میں نکما ہو گیا ہوں
مگر پہلے سے اچھا ہو گیا ہوں
مجھے تصویر سے باہر نکالو
میں اب خاصا پرانا ہو گیا ہوں
ترے شیریں لبوں نے چکھ لیا تھا
میں اب کڑوے سے میٹھا ہو گیا ہوں
ترے خوابوں نے پسپا کر دیا جب
تو آنکھوں سے نہتا ہو گیا ہوں
نجانے قرب میں ہے کرب کیسا؟
کہ پہلے سے بھی تنہا ہو گیا ہوں
اب آنا چاہتا ہوں اپنے تن میں
میں تجھ میں کچھ زیادہ ہو گیا ہوں
وہ مجھ کو پوجنے تک آ گیا ہے
تو کیا میں اتنا اونچا ہو گیا ہوں

ثمریہ قاضی/ساہیوال

(تازہ شعری مجموعے "اسون جل سینچ سینچ پریم بیل بوئی" سے منتخب شاعری)

ایک تصویر

ذرا اک کالے پیڑ کے نیچے
بال بکھیرے
اک بنجارن دیکھ رہی ہے
گھر کا رستہ
پاس گھڑا ہے
اک ٹوٹا سا
اور اک پیالہ ناگفتہ بہ
پیاس ہے اس تصویر کے اندر

تم ملنے نہیں آتے

ستارے پوچھتے ہیں رات کو آ کے
تمہارے سب پتے
کہاں رہتے ہو تم
کیوں مجھے ملنے نہیں آتے
کئی موسم بہت سے پیارے پیارے رنگ لاتے ہیں
مرا در کھٹکھٹاتے ہیں
کبھی پیاری ہوائیں، خوشبوؤں کے سنگ آتی جاتی ہیں
میرا آنچل ہلاتی ہیں......
تمہیں شاید بلاتی ہیں
دھنک اپنے سبھی رنگوں کو لے کر
جانے کتنی بار
دروازے پہ جاتی ہے
درختوں کے بھی پتے تمہاری راہ تکتے ہیں
میری آنکھوں میں اب اکثر
اُداسی ٹھہر جاتی ہے
گزرگاہوں میں جیسے دُھند آ کے
رک سی جاتی ہے
گلہ کرنا نہیں اچھا......
گلہ کرنا کہاں تک ہو......
ستارے پوچھتے ہیں رات کو
اور دن کو سب رستے
انہیں بھی اب گلہ ہے یہ
"کہ تم ملنے نہیں آتے"

بے نشاں

محبت اس قدر بے نور کب تھی
اور ایسی بے نشاں میں بھی نہیں تھی
کہ اک پل میں
مرے ہونے...... اور نہ ہونے میں
کچھ بھی فرق کب تھا
میں بے وقعت ہوئی ایسے
میرے اندر
مرے جینے کی جو اک آخری باقی وجہ تھی
مر گئی ہے
میرے دل میں اُداسی
قبر کی مٹی کی صورت بھر گئی ہے

Reality

میرے سوکھے ہوئے ہونٹوں پہ لکھا ہے
کہ اب جانے کا لمحہ ہے
بچھڑنے کی گھڑی جو تاک میں تھی
آن پہنچی ہے
میں ساری خواہشوں کو دان کر کے بھی
تمہاری گود میں سر کو چھپا کر سو نہیں پائی
تمہارے ساتھ کچھ لمحے میسر بھی ہوئے تو
تعاقب میں جدائی دوڑتی آئی
میرے دل میں جو وحشت اور اُداسی کا بسیرا تھا
اور بھی کچھ بڑھ گیا ہے
مرے آنگن میں اب مدت سے تتلی بھی نہیں آئی
نہ چڑیا نے پکارا ہے
یہ جو کچھ ہے کسی اگلے سفر کا استعارہ ہے
یہی رُخصت کا لمحہ ہے
مجھے اب الوداع کہہ دو

نارسائی

جب اس سے وعدہ کوئی نہیں
ملنے کا ارادہ کوئی نہیں
پھر کیوں آنکھیں دروازے کو
اک آس میں تکتی رہتی ہیں
اس کو نہیں آنا...... جانتی ہیں
نادان ہیں تکتی رہتی ہیں

آخری فیصلہ

ایوب صابر

پہاڑی ٹیلے سے آتی بانسری کی صدا فضاء کو مسحور کُن بنا رہی تھی۔ بانسری کی آواز میں ایسا جادو کہ انسان تو کیا اڑتے پرندے بھی اس آواز کو سننے کے بعد زمین پر اتر آئیں۔ آج پھر گُل زمان نے چنار کے نیچے اپنی مخصوص جگہ پر بیٹھ کر بانسری کے سُر چھیڑے تھے۔ 12 سالہ گُل زمان اپنے بوڑھے باپ بخت خان کی امیدوں کا واحد مرکز اور پانچوں بہنوں کا اکلوتا بھائی تھا۔ بخت خان کی بیوی جنت بی بی بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جی رہی تھی۔

بخت خان کے چہرے پر اب بڑھاپے کے آثار نمایاں ہونا شروع ہو گئے لیکن چہرے کی ہر جھری کے اندر ایک امید پروان چڑھ رہی تھی۔ وہ سوچتا کہ میرا بیٹا جب جوان ہو گا تو میرے دِلدّر دور ہو جائیں گے۔ بخت خان پتھر توڑ کر اپنے کنبے کا پیٹ پال رہا تھا۔ پتھر تو جوہری بھی توڑتا ہے لیکن سنگ شکن اور جوہری میں بہت فرق ہے۔ جوہری جب پتھر توڑتا ہے تو اُس کے گال خوشی سے لال ہو جاتے تھے لیکن بخت خان جب پتھر توڑتا تو اُس کے ہاتھ خون رِسنے کی وجہ سے لال ہو جاتے، تب اُسے یاد آتا کہ اُس کی بڑی بیٹی کب سے جوان ہو چکی تھی جس کے ہاتھ ابھی تک پیلے نہیں ہو سکے۔ ایک دن بخت خان نے جنت بی بی سے کہا "میری ماں نے میرا نام بخت خان اس لئے رکھا ہو گا کہ میرے بخت اعلیٰ ہوں لیکن میں تو زندگی بھر بخت کی چکی میں پیتا رہا ہوں۔"

بخت خان کا گاؤں ایک دور افتادہ پہاڑی علاقے میں تھا۔ یہ علاقہ خوبصورتی میں اپنی مثال آپ تھا۔ گاؤں کی دلکشی کا اگر فضاء سے نظارہ کیا جائے تو بڑے سے پیالے میں ایک تراشیدہ موتی کی مانند نظر آتا۔ پہاڑوں کے دامن میں پھیلا سبزہ خوشنما گملے کی طرح دکھائی دیتا۔ گاؤں کی ایک طرف آبشار کا بہتا پانی ترنم پیدا کرتا، اس آبشار کا پانی گرمیوں میں ٹھنڈا اور سردیوں میں گرم ہوتا تھا۔ گاؤں کے ارد گرد پہاڑوں پر چنار اور اخروٹ کے درخت کسی چاک و چوبند محافظ کی طرح ایستادہ تھے۔ سردیوں کے موسم میں ان پہاڑوں پر برف کی چادر بچھ جاتی، جس کی وجہ سے ساری زمین چاندی میں نہا جاتی اور گرمیوں کے آغاز میں جب یہ برف موم کی طرح پگھلنا شروع ہوتی تو ندی کا پانی اسے اپنی آغوش میں سمو لیتا اور دھرتی ہریالی کی پوشاک پہن لیتی۔

بخت خان کے گاؤں میں اسکول نہ ہونے کی وجہ سے گُل زمان مدرسے کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ کچھ عرصے سے بخت خان نے محسوس کیا کہ گُل زمان خاموش رہنے لگا تھا۔ اُس کی بانسری بھی اُسے پکارتی لیکن وہ بانسری اور اُس کی آواز کو بھولتا جا رہا تھا۔ وہ بانسری جس کی دلکش آواز سن کر لوگ محظوظ ہوتے تھے وہ خاموش ہو چکی تھی۔ گُل زمان کا رویہ بہنوں اور ماں کے ساتھ بھی سخت ہو چکا تھا اس لئے سب اُس کے رویے کو برداشت کر رہے تھے۔ گُل زمان جب مدرسے سے پڑھ کر گھر آتا تو اُس کا دل گھر پر بھی نہیں لگتا، وہ اکثر دوستوں کے ساتھ وقت گزارتا یا اکیلا دور کہیں پہاڑی ٹیلے پر بیٹھ کر سوچ میں گم رہتا۔ اُس کے بدلے ہوئے رویے کو تمام اہلِ خانہ محسوس کر رہے تھے۔

پچھلے کچھ عرصے سے گاؤں میں کچھ اجنبی لوگوں کا مدرسے کے استاد مولوی نور خان کے پاس آنا جانا معمول کی بات ہو گئی تھی۔ ہتھیاروں سے لیس یہ اجنبی لوگ اکثر خاموشی سے آتے اور حجرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے۔ جتنی دیر تک وہ لوگ حجرے میں موجود رہتے، کسی کو اندر آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ گاؤں کے لوگوں نے اندازہ لگا لیا کہ ہر گزرتے دن کے ساتھ مولوی نور خان کے گھر میں خوشحالی کے آثار نمودار ہونا شروع ہو گئے اور کچھ ہی عرصے میں اُس نے اپنے بیوی بچوں کو شہر میں عالی شان مکان لے کر وہاں بھیج دیا۔ کل تک وہ اہلِ گاؤں کے چندے پر گزارہ کرتا تھا اب اُس کی جیب کرارے نوٹوں سے گرم رہنے لگی۔

"تمھیں اب بڑے مدرسے میں جانا ہے لیکن اس بات کا ذکر تم اپنے گھر والوں سے بھی نہیں کرو گے۔" مولوی نور خان نے گُل زمان سے رازدارانہ لہجے میں کہا۔

"جیسے آپ کا حکم مولوی صاحب۔" گُل زمان نے فرمانبردار شاگرد کی طرح ہاں کر دی۔

"کل تم جلدی مدرسے آنا ایک خاص کام ہے۔" مولوی نور خان نے کہا۔

گُل زمان نے احتراماً سر جھکا لیا۔

آج بہت دنوں بعد گُل زمان مطمعن نظر آ رہا تھا

کیونکہ مولوی نور خان نے کسی بڑے مشن کے لئے اُس کا انتخاب کرلیا تھا۔

اگلے روز گُل زمان مدرسے آیا تو مولوی نور خان نے اُسے ضروری ہدایات کے بعد کچھ اجنبی لوگوں کے حوالے کر دیا۔ دوپہر کے بعد جب گُل زمان گھر نہیں لوٹا تو ماں فکر مند ہوگئی۔ وہ بار بار بیٹیوں سے ذکر کر رہی تھی "آج گُل زمان نے گھر آنے میں دیر کر دی۔" بہنوں کو بھی فکر لاحق ہو رہی تھی۔ گھر میں ایک بے چینی کا عالم تھا۔ اتنی دیر میں بخت خان بھی مزدوری کر کے لوٹ آیا۔ گھر داخل ہوتے ہی اُس نے ابھی پگڑی سر سے اتاری کہ سب کے متفکر چہرے نظر آئے۔

"تم سب پریشان لگ رہے ہو اور گُل زمان کہاں ہے؟" بخت خان نے حیرت سے پوچھا۔

"آپ جلدی سے مدرسے جا کر معلوم کریں، گُل زمان ابھی تک گھر نہیں لوٹا۔" جنت بی بی نے جواب دیا۔

بخت خان نے دوبارہ پگڑی سر پر رکھی اور تیز قدموں سے پلٹ گیا، سارے راستے اُس پر گھبراہٹ طاری تھی اور وہ اسی حالت میں مدرسے پہنچا۔

"گُل زمان کہاں ہے، ابھی تک گھر نہیں لوٹا؟" بخت خان نے مولوی نور خان سے پوچھا۔

"آج تو گُل زمان مدرسے آیا ہی نہیں، آپ اُس کے دوستوں سے معلوم کریں یا ندی کی طرف جا کر دیکھیں، وہاں ہوگا۔" مولوی نور خان نے لاپرواہی سے جواب دیا۔

بخت خان کے تو پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ وہ حواس باختہ ہو کر گُل زمان کے دوستوں کو تلاش کرنے لگا تاکہ بیٹے کا کوئی سراغ لگایا جاسکے لیکن ہر کوئی گُل زمان کے متعلق لاعلمی کا اظہار کر رہا تھا۔ صرف ایک دوست نے اتنا کہا "اُس نے گُل زمان کو صبح کے وقت مدرسے کی طرف جاتے ہوئے دیکھا تھا۔"

"لیکن یہاں تو مولوی نور خان صاف انکار کر چکا تھا کہ گُل زمان مدرسے آیا ہے۔" بخت خان نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

ادھر گھر پر جنت بی بی کا دل بیٹھا جا رہا تھا کہ بخت خان ابھی تک گُل زمان کو لے کر کیوں نہیں آیا۔ وہ بار بار دروازے تک آتی اور پھر لوٹ جاتی۔ بہنوں کے چہرے پر بھی ہوائیاں اڑی تھیں۔ بخت خان بھاگتے ہوئے گھر آیا۔

"گُل زمان آج مدرسے نہیں گیا اور کوئی بھی اُس کے متعلق کچھ نہیں بتا رہا۔" بخت خان نے یہ اندوہناک خبر اپنے خاندان کو سنادی۔

یہ خبر کسی بم کی طرح تھی۔ پورا خاندان اپنے سر پکڑ کر بیٹھ گیا کہ اب گُل زمان کو کہاں تلاش کیا جائے۔ ماں کے آنسو تھمنے کا نام نہیں لے رہے تھے، بہنوں کا رو رو کر برا حال ہو رہا تھا۔ بخت خان کی بھی ہمت جواب دے رہی تھی، وہ بخت خان جس نے ساری زندگی پتھر توڑ کر روزی کمائی، آج خود ٹوٹ گیا تھا۔ اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا کہ آخر چھوٹے سے گاؤں سے اُس کا جگر گوشہ کیسے غائب ہوگیا۔

گُل زمان ایک بڑے مدرسے میں پہنچ چکا تھا۔ جہاں اُس کو پہلے دن ہی مدرسے سے متصل حجروں کی سیر کرائی گئی۔ وہاں دیواروں پر حوروں کی خیالی خوبصورت تصاویر اور دلکش باغات اور نہروں کی تصاویر بنی ہوئی تھیں۔ گُل زمان اب ایک نئی دنیا میں کھو چکا تھا۔ اُس کا برین واش کر کے اُسے خودکش بمبار کے طور پر تیار کیا جا رہا تھا۔ اُسے دن رات یہ سبق پڑھایا جا رہا تھا کہ اگر تم کسی مخصوص عبادت گاہ کے اندر گھس کر بم بلاسٹ کر دو گے تو سیدھے جنت میں جاؤ گے۔ اسی لئے دیواروں پر جنت کی خیالی تصاویر اور وہاں کی نعمتوں کو پورٹریٹ کیا گیا تھا۔ انسان کی فطرت ہے کہ وہ بصارت کے ذریعے بہت جلد سیکھ جاتا ہے۔ اُدھر گُل زمان جنت میں جانے کی تیاری کر رہا تھا اِدھر اُس کا گھر تمام اہل خانہ کے لئے ایک دوزخ بن چکا تھا۔ اُس کے گھر میں آہوں اور سسکیوں کے سوا کوئی آواز نہیں تھی۔

بالآخر گُل زمان کو خودکش جیکٹ بلاسٹ کرنے کے تمام مراحل سکھا دیئے گئے۔ اُس کے اور جنت کے درمیان فاصلہ کم ہو رہا تھا۔ وہ جنت کے شوق میں یہ بھی بھول چکا تھا کہ اُس کے گھر میں جنت بی بی کی گود ویران نظر آ رہی تھی۔ وہ ماں جس کے قدموں تلے اُس کی جنت ہے، وہ پاگلوں کی طرح اب اکثر ننگے پاؤں گھر میں گھومتی رہتی اور دن رات اُس کی تصویر کو بوسے دیتی رہتی۔ بخت خان کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی تھی۔

"اے ساری مخلوق کی فریاد سننے والے! میری فریاد بھی سن لے، میں اپنی عرضی تیرے دربار میں پیش کر رہا ہوں، میرے جگر گوشے کو گھر لوٹا دے۔" بخت خان ہاتھ اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھ کر کہتا۔

جنت بی بی ہر آہٹ پر یہ سوچتی کہ شاید گُل زمان آگیا۔

آخر وہ دن آگیا جس کے لئے گُل زمان کو تیار کیا گیا تھا۔ مدرسے کا ہر استاد اُسے گلے لگا رہا تھا اور

''خاص مشن'' میں کامیابی کی دُعائیں دے رہا تھا۔ ہر طرف مبارکباد کی صدائیں تھیں گویا گل زمان ''عشرہ مبشرہ'' میں شامل ہو گیا۔ اُسے ایک بار پھر ویڈیو کی مدد سے خودکش جیکٹ بلاسٹ کرنے کا طریقہ دیکھایا گیا ۔گل زمان کو جیکٹ پہنا کر اُس کے ٹارگٹ پر پہنچا دیا گیا۔ وہ اس مشن میں اکیلا ہی تھا۔ گل زمان عبادت گاہ میں داخل ہو چکا تھا۔ اُس نے عبادت میں مصروف لوگوں کو نظر بھر کر دیکھا تو ہر کوئی اپنے خالق سے گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی کا طلبگار تھا۔ اُس نے وہاں کچھ معصوم بچے بھی دیکھے جن کے چہرے فرشتوں کی طرح نظر آرہے تھے۔ گھر سے نکلنے کے بعد آج پہلی دفعہ اُسے اپنا گھر شدت سے یاد آیا۔ اُس نے خودکش جیکٹ کی ہُک پر ہاتھ رکھ لیا لیکن اُس سے وہ ہُک کھینچی نہیں جا رہی تھی۔ اُس نے اگلے ہی لمحے ایک اہم فیصلہ کیا۔ وہ خالق کائنات کے حضور کھڑے ان باادب لوگوں کا خون نہ بہا سکا اور تیزی سے باہر نکل آیا۔ اُدھر اُس کے آقا ٹی وی پر مشن کی کامیابی کی نوید سننے کے لئے بے چین تھے اور وہ اپنے گھر جنت بی بی کی جنت کی طرف لوٹ آیا۔

گل زمان نے جب اپنے گھر کے دروازے پر دستک دی تو ہاتھ اور دروازے کے درمیان اجنبیت کا رشتہ بن چکا تھا۔ اُس کی سب سے بڑی بہن نے دستک سن کر اندر سے پوچھا کہ کون ہے؟'' میں ہوں گل زمان، دروازہ کھولو'' آواز میں اس قدر درد تھا گویا کسی اندھے کنویں سے آرہی تھی۔

بڑی بہن نے جھٹ سے دروازہ کھولا اُس کی زبان سے کوئی لفظ نہیں نکل سکا، صرف ایک چیخ تھی جسے سن کر جنت بی بی اور بخت خان ایک ساتھ دروازے کی طرف بھاگے، بڑی بہن والہانہ انداز میں گل زمان کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر رونے لگی۔ جنت بی بی کو کچھ نہیں آرہا تھا کہ اس موقع پر کیسے اظہار کرے، وہ اپنے لعل کو سینے سے لگا کر اُس کا منہ چومنے لگی اور سلامتی کی دُعائیں کرنے لگی۔ بخت خان کے بھی بخت جاگ گئے تھے۔ جونہی جنت بی بی نے بیٹے کو خود سے جدا کیا بخت خان نے اپنے سینے کی ٹھنڈک کو سینے سے لگا لیا۔ جنت بی بی کی طرح بخت خان کی بھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ ان تمام آوازوں کو سن کر چھوٹی چاروں بیٹیاں بھی دروازے کے پاس آکر بھائی کو دیکھ دیکھ کر خوش ہونے لگیں۔ تمام اہل خانہ بار بار گل زمان کو دیکھ رہے تھے اور لبوں پر شکرانے کے الفاظ تھے۔ جنت بی بی نے پوچھا'' گل زمان تم کہاں چلے گئے تھے؟''

''میں نے کہاں کہاں تمھیں نہیں تلاش کیا؟'' بخت خان نے کہا۔

گل زمان ابھی خاموش تھا۔ سارے گاؤں میں یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیل چکی تھی۔ ہر کوئی بخت خان کے گھر کا رخ کر رہا تھا سوائے مولوی نور خان کے، باقی تمام بچے بوڑھے گھر کے باہر جمع ہو چکے تھے۔ اب گل زمان نے تمام واقعات تفصیل سے گوش گزار کیے۔ کس طرح مولوی نور خان نے اُسے بڑے مدرسے روانہ کیا اور بڑے مدرسے والوں نے اُسے کون سا مشن سونپا تھا۔

گاؤں کے تمام بزرگ گل زمان کو ساتھ لے کر مولوی نور خان کے پاس مدرسے پہنچ گئے۔ انہوں نے مولوی نور خان سے اتنے بڑے دھوکے اور ظلم کی بابت دریافت کیا۔ آج مولوی نور خان سر جھکائے بیٹھا اپنے کیے پر نادم تھا۔

''تمھیں اِس معصوم کو جلادوں کے حوالے کرتے ہوئے اپنے بچے یاد نہیں آئے؟'' ایک بزرگ نے مولوی نور خان سے پوچھا۔

''میں اپنے اس فعل کا بدلہ چکاؤں گا۔'' مولوی نور خان نے پہلی دفعہ زبان کھولی۔

گل زمان نے جیکٹ اتارنے سے پہلے اس کو پہننے اور بلاسٹ کرنے کا طریقہ سب کو بتایا اور مولوی نور خان کو جیکٹ واپس کر دی جو اُس نے کچھ سوچ کر اپنے پاس رکھ لی۔

اگلے روز مولوی نور خان کو بڑے مدرسے سے پیغام آیا کہ تم نے کیسا لڑکا ہمارے حوالے کیا تھا جو اپنا مشن نامکمل چھوڑ کر گھر لوٹ گیا۔ انہوں نے سخت الفاظ میں سرزنش کرتے ہوئے مولوی نور خان کو پیغام دیا کہ تم مدرسے آکر اپنی اس کوتاہی کی وضاحت کرو۔ کیا یہی دن دیکھنے کے لئے ہم نے تمھارے اوپر دولت کی بارش کی تھی۔ ہم نے اصلی نوٹ دیے لیکن تمھارا سکہ کھوٹا نکلا۔

مولوی نور خان وہ جیکٹ پہن کر بڑے مدرسے پہنچ گیا۔ ایک استاد نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔

وہ مولوی نور خان کو حقارت بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ مولوی نور خان نے ایک نظر پورے منظر پر ڈالی تمام اساتذہ موجود تھے، مولوی نور خان نے آخری فیصلہ کر لیا تھا، اُس نے خودکش جیکٹ کی ہُک کھینچ دی اور ایک دھماکے سے ساری عمارت زمین بوس ہو گئی۔ انسانیت کے دشمن اپنے ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔ مولوی نور خان نے گل زمان کا نامکمل مشن پورا کر دیا تھا۔

تضاد

سعدیہ بتول

جس قدر تیزی سے طبلہ نواز کی انگلیاں طبلے پر متحرک رہی تھیں اتنی ہی تیزی سے رقاصہ کا متناسب جسم متحرک تھا۔ وہ بال کھولے یہاں سے وہاں جلوے بکھیر رہی تھی۔ طبلے اور گھنگھروؤں کی مشترکہ آواز اور جھلملاتی ہوئی روشنیوں سے سجے بام و در رات کے اس پہر کو سکوت اور تاریکی سے بے نیاز کر کے پر ہنگام سے میں بدل رہے تھے۔ رقاصہ کے پاؤں کی انگلیاں کثرت مشق سے تپلی اور پھیل کر کسی چمگادڑ کے پنجوں سے مشابہ ہو چکی تھیں۔ تقریباً چودہ برس کی عمر سے وہ اس شعبے سے وابستہ تھی۔ اب جبکہ وہ اک مشاق رقاصہ بن چکی تھی اس کے فن کی بساط پلٹنے کو تھی۔ جیسا کہ ہر انسان جب تجربہ کار ہو چکتا ہے تو اس دنیا میں اس کی زندگی اختتام کی جانب رو بہ سفر ہو جاتی ہے اسی طرح فن کار بھی فن کے عروج کو پا لینے کے بعد زوال کی پستیوں کی جانب گامزن ہو جاتا ہے۔ وہ تھکنے لگی تھی۔ جوانی کی چمک دمک بھی ماند پڑ رہی تھی۔ اسی لیے تو میک اپ کا خرچ بھی بڑھنے لگا تھا۔ میں کی موٹی تہہ بھی بڑھاپے کے نشانات مٹانے میں ناکام ہو رہی تھی۔ جس طرح شمع بجھنے سے قبل ایک مرتبہ تیزی سے بھڑکتی ہے اسی طرح وہ بھی آج شعلہ جوالہ بنی ہوئی تھی۔ اس کے گرد تماش بینوں کی حریص نگاہوں کا اک ہجوم تھا جو اس کی اک اک ادا پہ جیبیں الٹ رہے تھے۔ آج جشن کا دن جو تھا۔ ملک صاحب کا بیٹا سحاب سالوں بعد تعلیم مکمل کر کے وطن لوٹا تھا۔ بڑے ملک صاحب سامنے چاندنی پہ گلے میں پان کی گلوری دابے گویا ہاتھ میں جنبش نہیں آنکھوں میں تو دم ہے کی عملی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ آس پاس دیگر گاؤں کے بااثر لوگوں اور احباب کا مجمع تھا۔ ان سب کی نگاہیں اس شرارے کی مانند تھرکتے وجود کے ساتھ متحرک تھیں۔ یہ ایک مہنگا تماشہ تھا اس لیے اس سے صرف امراء ہی محظوظ ہو سکتے تھے جس طرح انسانی گوشت سے بنی ہوئی ڈشز مہنگی ترین غذا میں شمار ہوتی ہیں اور ان کی لذت سے صرف امیر طبقہ ہی لطف اندوز ہو سکتا ہے بالکل اسی طرح یہ انسانی تماشہ بھی بھاری جیبوں والوں کیلئے تھا۔ دولت انسانوں میں تفریق و امتیاز پیدا کرنے کا سب سے طاقتور ہتھیار ہے جس سے لیس ہو کر انسان اپنے جیسے انسانوں کے مقابل آ کھڑا ہوتا ہے۔ دولت کی چمک نگاہوں کو اس قدر خیرہ کر دیتی ہے کہ اپنی خواہشات کے آگے کچھ دکھائی ہی نہیں دیتا۔ نہ کسی مجبور کے آنسو۔۔۔ نہ کسی کے چہرے پہ پھیلی بے بسی کا کرب۔۔۔ نہ کسی کی عزت۔۔۔ نہ ہی حلال و حرام کا فرق۔۔۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ان سکوں کی کھنک میں کتنا شور ہوتا ہے جس کی آواز ہر مظلوم کی پکار کو دبا لیتی ہے۔ سحاب اس محفل کا حصہ ہونے کے باوجود گویا وہاں نہیں تھا۔ یہ محفل جو اسی کیلئے ہی سجائی گئی تھی اس کی اداسی کا سبب بن رہی تھی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ دولت کی پٹی نے نگاہوں کو کس قدر اندھا کر دیا ہے جو رقاصہ کے انگ انگ پر پھسل رہی ہیں اس کے ناز و ادا پر فدا ہو رہی ہیں لیکن اس کی آنکھوں سے چھلکتی بھوک اور بے چارگی سے قطعاً بے خبر ہیں۔ دور اک خیمے سے اس کے چھوٹے بچے کی دودھ کیلئے بلکنے کی آواز شاید کسی کو نہیں آ رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر اپنے ارد گرد نگاہ دوڑائی ہر چہرہ مطمئن اور قہقہہ بار تھا۔ اس نے وحشت سے اپنے جی کو ٹٹولا کیا اس رقاصہ کی آنکھ میں دکھ کی بدلی میرے سوا کسی کو دکھائی نہیں دے رہی؟ اس کے بچے کی رونے کی آواز کسی کو سنائی نہیں دے رہی؟ یا پھر ان لوگوں کی سماعتیں اور بصارتیں دوسروں کے دکھ سکھ محسوس کرنے کی صلاحیت کھو چکی ہیں؟ یہ بے حسی کی کونسی منزل ہے جس پہ کسی اپنے جیسے انسان کی عزت، انا اور غیرت کا سودا کر لیا جاتا ہے۔ چند نوٹ کسی کی مجبوریوں کی قیمت ٹھہرتے ہیں۔ بہت چھوٹی عمر میں اس ماحول سے دور چلے جانے کے سبب وہ اپنے آبائی رسوم و رواج سے کافی حد تک بے خبر تھا۔ اس کا خیال تھا کہ جیسے باقی دنیا بدلی ہے اس کا گاؤں بھی ضرور تبدیل ہو گیا ہو گا۔ لیکن یہاں تو کچھ بھی نہ بدلا تھا۔ وہی آقا و غلام کا تعلق، وہی ظالم و مظلوم کی تفریق۔۔۔ آہ۔۔۔ اسی طرح بکتی مجبوری اور بھوک۔ گوروں کے دیس میں بھی ناچ گانا عام تھا لیکن فرق یہ تھا کہ وہ لوگ اپنی خوشی میں خود ناچتے تھے اور وہ بھی علی الاعلان، یہاں کی طرح دن بھر

شرافت کا لبادہ اوڑھے راتوں کو چوری چھپے پولیس کی جیبیں گرم کر کے ایسی تقریبات منعقد نہیں کرتے تھے۔ رات کے تین بجے محفل برخاست ہوئی تو سحاب بھی بابا جان کے ہمراہ گاڑی میں سوار ہو کر حویلی کی جانب روانہ ہو گیا۔ یہ تقریب حویلی سے دور زمینوں پہ بنے ڈیرے پہ منعقد کی گئی تھی۔ رات کو دیر سے سونے کے سبب اگلے روز وہ دن چڑھے تک پڑا سوتا رہا۔ اس کی نیند تو ابھی بھی باقی تھی لیکن باہر سے آنے والی شور کی آوازیں اسے عالم ہوش میں لے آئی تھیں۔ بابا جان شدید غصے میں تھے کہہ رہے اس بے حیا سے دور ہو جائے میری نگاہوں سے، میں اس کی شکل نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس بے۔۔۔ بے چاری کا کیا قصور ہے۔۔ وہ۔۔ وہ تو میں نے اسے ڈاکٹر کے پاس بھجوا دیا تھا ورنہ بلک بلک کر یہیں جان دے دیتی۔ تجھے فیصلے کرنے کا اختیار کس نے دیا ہے آج تک کبھی سنا ہے ملک گلفراز کی حویلی کی کسی خاتون پر کسی کی نگاہ بھی پڑی ہو۔ او تو کیا جانے حویلیوں کی روایات کو عمر گزار دی یہاں پر اصلیت نہ بدلی۔ ہماری عورتیں مرتی مر جاتی ہیں پر پاؤں باہر نہیں دھرتیں۔ اماں جان کی کھکھیا ئیں کہ سیڑھیوں سے گرنے کی وجہ سے اسے گہری چوٹ آئی تھی اور خون بھی بند نہیں ہو رہا تھا تو۔۔۔ اچھا بس زیادہ بک بک کی ضرورت نہیں لیکن آئندہ کوئی ایسی بات ہوئی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔ بابا جان کی تحکمانہ آواز کے بعد خاموشی چھا گئی۔ اب صرف وقفے وقفے سے قندیل کی سسکیوں کی آواز ابھر رہی تھی۔ اف۔۔ کس قدر سفاکی تھی ان کے رویے میں؟ اپنی حویلی کی عورت کسی اشد مجبوری کے تحت بھی باہر نہیں نکل سکتی۔ اس کیلئے محرم اور نامحرم کا اصول بھی ہے گویا نعوذ باللہ اسلام صرف عورتوں کیلئے نازل ہوا ہے۔ بلکہ اس سارے معاملے میں اسلام تھا ہی کہاں۔ یہ تو وہ دین ہے جس کی اساس ہی مساوات پر قائم ہے جو دوسروں کیلئے بھی وہی کچھ پسند کرنے کا حکم دیتا ہے جو انسان خود اپنے لیے پسند کرتا ہو۔ یہاں تو مردوں نے اپنے مفادات کیلئے کچھ اصول وضع کر کے انہیں عورتوں پر جبراً لاگو کر دیا تھا۔ جن کی رو سے تمام حقوق مردوں اور فرائض عورتوں کے ذمے ہو گئے تھے۔ اس کے ذہن کے پردے پر بار بار بیتی ہوئی رات کے مناظر ابھر رہے تھے۔ کیا وہ رقاصہ کسی کیلئے نامحرم نہ تھی؟ کیا وہ سب مرد اسے اس قدر غیر مناسب حلیے میں دیکھنے کا حق رکھتے تھے؟ کیا وہ تماش بینوں کا انبوہ اپنا اسلام کہیں گروی رکھ آیا تھا؟ کیا وہ عورت کسی کی بیٹی نہ تھی؟ اپنی عورتوں کیلئے پردے کے احکامات کا پرچار کرنے والے خود کو کتنے دھڑلے سے اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیے ہوئے تھے۔ اتنے بڑے ہجوم میں سے کسی ایک کو بھی تو اپنے وہاں ہونے یا کسی نامحرم کو قابل اعتراض حالت میں دیکھنے پر کوئی ندامت نہ تھی۔ کیا گھر کے اندر اور باہر کے استعمال کیلئے الگ الگ اسلام تھے؟ ایک کے بعد ایک سوال اس کے ذہن پر کوڑے برسا رہا تھا اور اس کے جذبہ بغاوت کو ابھار رہا تھا۔

سرور ارمان

بلندیوں سے گریں تو ٹوٹیں نہ خواب کیسے
رہِ طلب میں سوال کیسے، جواب کیسے
یہ زندگی کتنی غیر محفوظ ہو گئی ہے
یہ قاتلوں نے پہن لیے ہیں نقاب کیسے
سفید ہوتا ہے خون کس طرح آدمی کا
عزیز رشتوں کے بند ہوتے ہیں باب کیسے
بتانا ممکن نہیں کہ صحرا کی وسعتوں میں
لپٹ کے پیروں سے چیختے تھے سراب کیسے
ملا ہوا ہے تمہارا قانون مجرموں سے
کرو گے غارت گروں کا تم احتساب کیسے
تمہیں خبر ہے کہ ہم غریبوں کی بستیوں میں
غروب ہوتے ہیں عمر کے آفتاب کیسے
نظامِ زر قتلِ آدمیت کا مرتکب ہے
جو یہ نہ بدلا تو آئے گا انقلاب کیسے
خزاں کو بھی مات دے کے رکھ دی ہے اس گلشن نے
کھلیں گے دوزخ کی اس تپش میں گلاب کیسے
ہجومِ فاقہ کشاں تھا، تم تھے، کتابِ جاں تھی
میں کرتا اس کا تمہارے نام انتساب کیسے

....

چھپ کے جب بیٹھے تھے ہم دنیا سے رشتہ توڑ کر
آ گئی باہر تری تصویر شیشہ توڑ کر
ماں ہوئی رخصت تو یہ منظر بھی دیکھا آنکھ نے
پھیلتا ہے کس طرح دریا کنارہ توڑ کر

ڈاکٹر عمرانہ مشتاق

ٹیوب لائٹ کا دُکھ

عائشہ بالکل گڑیا کی طرح تھی۔ خوبصورت اور معصوم جو مرضی کہہ لیں بات نہیں کرتی تھی۔ گڑیا کو دیکھ کر جو پہلا خیال دل میں آتا ہے وہ اُس کے بیاہ کا ہوتا ہے۔ اُس کے ماں باپ کے دل میں بھی پہلا خیال یہی آیا اور اُس کا کم سنی میں بیاہ کر دیا گیا۔ بے جان گڑیا میں بھی سوئی چبھوئی جائے تو اُس کی آہ ضرور نکلتی ہے چاہے وہ کسی کو سنائی دے یا نہ دے عائشہ کی آہ اُس کے ہونے والے شوہر نے نہیں سنی۔ ہاں البتہ در و دیوار سمیت کمرے میں رکھی ہر چیز نے سنی۔ اسی آہ سے عائشہ کی زندگی کا آغاز ہوا اور برتن دھوتے کپڑے استری کرتے کھانا بناتے ساس سسر اور نندوں دیوروں کی خدمت کرتے اُن کی ہر بات سہتے، بچے پیدا کرتے اُن کی تربیت کرتے اُس نے زندگی کے 45 برس گزار دیے۔ اُس کے بال سفید ہو گئے جیسے کمرے میں لگی ٹیوب لائٹ کا رنگ تھا۔ جسم فربہ ہو گیا تھا اور عمر بھر کی مشقت کے بعد ہڈیوں میں درد رہنے لگا تھا۔ شوگر اور بلڈ پریشر کے علاوہ خفیہ طور پر کئی دیگر بیماریاں بھی عائشہ پر حملہ آور ہو چکی تھیں جن کا احساس اُسے اپنی طبیعت کی خرابی سے ہوتا تھا۔ 45 برس کوئی ایسی عمر نہیں تھی کہ اس میں اتنا سب کچھ ہو جائے مگر کم سنی کی شادی پھر رات دن کام، ذمہ داریاں، پریشانیاں ان سب نے مل کر اُسے بوڑھا بنا دیا تھا ورنہ اُس کے ساتھ کی ہم جولیاں تو ابھی جوانی کا منہ چڑاتی تھیں۔

شوہر کی محبت عمر بھر صرف بستر تک محدود رہی۔ اس لیے وہ اب تو بالکل ہی بستر سے لگ گئی تھی اُس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ذمہ داریوں کا بوجھ اُس کے سر سے ہلکا ہو چکا تھا۔ ساس سسر کی وفات ہو چکی تھی۔ دیور اور نندیں بیاہے جا چکے تھے۔ بچے بڑے ہو گئے تھے۔ اُن کی اپنی زندگی تھی شوہر بھی اکثر راتوں کو باہر رہتا بلکہ اب تو کئی کئی دن تک گھر نہیں آتا تھا اور نہ ہی فون کر کے خیریت دریافت کرتا تھا۔ وہ بستر پر لیٹی جانے کیا کیا سوچتی رہتی تھی۔ اُسے یوں لگتا جیسے اُسے دیوار سے لگا دیا گیا ہے۔ جیسے ٹیوب لائٹ لگی ہوئی تھی۔ وہ لگاتار ٹیوب لائٹ کو دیکھتی رہتی اور جانے کیا کیا سوچتی رہتی۔ اُس کی زندگی توں تو آہ بن کر ہی گزری لیکن اب کراہ بن چکی تھی۔ شوہر کی دوسری شادی کی خبر اُس پر بجلی بن کر گزری۔ یوں تو عملی طور پر اب ان کا تعلق برائے نام ہی تھا۔ ازدواجی تعلقات بھی تقریباً ختم ہو چکے تھے۔ عائشہ کو شوہر کی پروا بھی نہیں تھی مگر دوسری شادی کی خبر نے جیسے اُسے نیم مردہ کر دیا تھا۔ اس کی وجہ فطری تھی کہ عورت کیوں برداشت کرے اپنے شوہر کے ساتھ کسی اور عورت کو کہ اُس کی جگہ لے لے۔ اُس کی راتوں کی نیند اُڑ چکی تھی اور دل کا قرار بھی چھن گیا تھا۔ اُسے چار شادیوں کی مرد کو اجازت غیر مساوی تقسیم لگتی تھی اور پھر اس کی کوئی تلافی بھی نہیں تھی۔ وہ چلتے پھرتے بڑبڑانے لگی۔ کبھی کبھار گالیاں بھی دینے لگتی جن کا کوئی سر پیر نہ ہوتا۔ بچے اُس کی باتوں کو مذاق بنا لیتے۔ اب پہلے سے زیادہ وہ بستر سے لگی ٹیوب لائٹ کو تکتی رہتی جیسے اپنی اور ٹیوب لائٹ کی زندگی میں گہری مماثلت نظر آنے لگی تھی۔

جب اُس کی شادی ہوئی تھی اُن دنوں یہ ٹیوب لائٹ اُس کے کمرے میں لگائی گئی تھی۔ جس کمپنی نے اس ٹیوب لائٹ کو بنایا تھا وہ تو شاید اب بند ہو چکی تھی مگر اتنے برسوں میں یہ کبھی خراب نہیں ہوئی اور اس نے اس گھر کے اندھیروں کو روشنی میں بدلے رکھا مگر اب اس کی جگہ کچھ سالوں سے انرجی سیورز نے لے لی تھی اور اس کی موجودگی غیر اہم تھی۔ اتنی غیر اہم کہ اس کی طرف کسی کا دھیان بھی نہیں جاتا کہ اسے اُتار پھینکا جائے۔ وہ اسی غم میں سفید پڑتی جا رہی تھی کہ اُس کی جگہ انرجی سیورز نے لے لی تھی جو کم خرچ اور بالانشیں تھے۔ عائشہ کے شوہر کی نئی بیوی بھی بینک میں جاب کرتی تھی۔ جس سے اُس کو ہر ماہ کافی بچت ہو جاتی۔ اخراجات بھی کم ہو گئے تھے۔ مگر عائشہ اور ٹیوب لائٹ کا دکھ اُس گھر میں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ دونوں کا وجود سب کے لیے غیر اہم تھا۔

سونان اظہر جاوید کی زیرِ ادارت
ماہنامہ تخلیق لاہور
کا تازہ شمارہ مکمل اہتمام کے ساتھ
شائع ہو گیا ہے قیمت: 150 روپے
ملنے کا پتہ: ہاؤس نمبر E/12 شیراز ولاز فیز 1
نزد ٹویوٹا موٹرز، اسلام نگر والٹن روڈ، لاہور

ایک آنسو

ماں کی گم شدگی کی خبر اُس پر بجلی بن کر گری تھی۔ حالانکہ گزشتہ کئی برسوں سے اُس کا اب اپنی بوڑھی اور بیمار ماں سے تعلق صرف رسمی رہ گیا تھا۔ اس کی وجہ اُس کی شدید کاروباری مصروفیت تھی۔ گھر میں وہ تھوڑی دیر کے لیے آتا تو وہ وقت بیوی بچوں کے ساتھ گزارتا۔ ماں کے کمرے میں جانے سے اُسے پہلے پہل اُلجھن اور پھر وحشت سی ہونے لگی۔ دفتر سے واپس گھر میں داخل ہوتے یا دفتر جاتے ہوئے اگر ماں کے کمرے کا دروازہ کھلا ہوتا تو وہ کبھی کبھار ماں کے پاس کھڑے ہو کر اور اکثر اوقات دروازے میں کھڑے ہو کر حال پوچھتا جو کہ رسمی ہوتا جیسے کسی بچے نے اپنے سبق کو رٹا لگایا ہوتا ہے۔ اس دوران اُس کے چہرے سے عجلت اور بیزاری کے آثار نمایاں ہوتے۔ وہ ماں کی آنکھوں میں کبھی نہیں دیکھتا تھا۔ اس کی شاید بڑی وجہ شرمندگی کا احساس تھا۔ کچھ بھی ہو جیسا بھی ہو آخر تھا تو اُسی ماں کا بیٹا۔ جس نے اُسے زندگی کا ہر دکھ سہہ کے رات دن محنت کر کے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی۔ ماں نے اُسے ایسی صورت حال میں کبھی کچھ نہیں کہا بس لیٹی لیٹی خاموشی سے دیکھتی رہتی۔ کبھی محبت سے اور کبھی حیرت سے، کبھی اپنے بیٹے کی باتیں سن کر ہلکی سی مسکراہٹ اُس کے لبوں پر پھیل جاتی اور کبھی ایک آنسو ہزار ضبط کے باوجود گالوں تک لڑھک جاتا۔ اُس نے ماں کی مسکراہٹ کے پیچھے چھپے کرب اور آنسو کے اندر پوشیدہ دُکھ اور کسک کو کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ ہمیشہ ایسی صورتِ حال میں گھڑی کی جانب دیکھ کے اضطرابی کیفیت میں کمرے سے باہر آ جاتا باہر آتے ہی اُس کا غصہ تیز ہو جاتا۔ وہ ملازموں کو آوازیں دے کر بلاتا اور ڈانٹتا کہ ہزار بار کہا ہے ماں جی کے کمرے کا دروازہ بند رکھنے کو۔ کتنے کاہل، سست اور لاپروا ہو تم سب۔ یہ آوازیں اُس کی ماں بسترِ مرگ پر صاف سن رہی ہوتی۔ ہاں البتہ اپنی بیوی سے جب وہ سرگوشی میں کہتا کہ ماں کے کمرے کے دروازے کا تم خود خیال رکھا کرو تو یہ آواز اُس بیماں کے کانوں تک کبھی نہیں پہنچتی تھی۔ ماں کی اچانک گم شدگی کی اطلاع نے اُسے مکمل طور پر جھنجھوڑ کے رکھ دیا تھا۔ اُس کی ذات تہہ و بالا ہو گئی تھی۔ بہت سے واہمے اور خوف اُس کے اندر اچانک بیدار ہو گئے تھے۔ رشتہ داروں، دوستوں اور لوگوں کو کیسے فیس کر پاؤں گا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ اس اذیت سے نکل کر ایک نئے کرب میں داخل ہو گیا۔ اُس کے لیے یہ بات انتہائی حیرت ناک اور افسوس ناک تھی کہ چند دن کے استفسار، سوالات اور تجسس کے بعد سب نے اُس کی ماں کی گم شدگی سے متعلق اُس سے پوچھنا چھوڑ دیا تھا جیسے اُس کی ماں کا گم ہو جانا کوئی غیر اہم واقعہ ہو۔ جس طرح موبائل فون یا گھر کی کوئی چیز گم ہو جایا کرتی ہے۔ سب لوگ بوقت ملاقات اُس سے کاروبار یا دیگر مصروفیات سے متعلق پوچھتے یہاں تک کہ مذاق اور چھیڑ چھاڑ میں نئی گرل فرینڈ سے متعلق بھی سوال کرتے لیکن اُس کی ماں کے متعلق کوئی نہ پوچھتا جیسے شہر میں ماؤں کا گم ہو جانا معمول کی بات ہو۔ اُس کے لیے اچنبھے کی بات یہ تھی کہ اُس کی ماں تو بمشکل واش روم تک چل کے جاتی تو گھر سے باہر جو کہ ایک کنال پر محیط تھا کیسے باہر چلی گئی۔ وہ اپنی ماں کی گم شدگی کی خبر کو مرنے نہیں دینا چاہتا تھا۔ ماں کی محبت جو کہ اُس کے اندر کب کی دفن ہو چکی تھی لحد شق کر کے باہر آ گئی اور اُس کا صبر و قرار لوٹ لیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہر کے سب لوگوں کی زبان پر اُس کی ماں کی گم شدگی کا ذکر ہو وہ گلیوں، بازاروں اور شہر کی مختلف جگہوں پر اب دن بھر اپنی ماں کو تلاش کرتا اُسے اس کے علاوہ سب کچھ بھول گیا تھا۔ بیوی اور بچے بھی مگر وہ جس شخص سے بھی اپنی ماں کی گم شدگی کا ذکر کرتا وہ اُسے حیرت سے دیکھ کے آگے بڑھ جاتا۔ بالآخر اُس نے تھانے میں رپورٹ لکھوانے اور اخبارات اور ٹی وی میں اشتہار دینے کا فیصلہ کیا۔ مگر اس کے لیے اُسے اپنی ماں کی تصویر کی ضرورت تھی۔ اُس نے اپنی ماں کی تصویر ڈھونڈنی شروع کر دی اپنے کمرے میں الماریوں، درازوں یہاں تک کہ اپنے سامان اور گھر کے کونے کونے میں۔ مگر اُسے اپنی ماں کی تصویر نہ ملی۔ تلاش کرنے کے دوران بے چینی، اضطراب اور کرب کی حالت سے وہ نیم پاگل ہوا جاتا تھا۔ پھر چند لمحوں میں بچپن سے لے کر اب تک ماں کے ساتھ گزرے محبت بھرے تمام لمحات اُس کی آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگے اور ایک آنسو لڑھک کر اُس کے گالوں تک پھیل گیا۔ انسپکٹر نے جب اُس سے پوچھا تمہاری ماں کا حلیہ کیسا تھا تو بمشکل اُس کے لبوں سے ایک آنسو نکلا۔

شاعری (غزل، نظم)

جو آبروئے جلوۂ گلزار ہو گئے
آخر وہ پھول زینتِ بازار ہو گئے
پھر بھی نہ ترجمانیٔ جمہور ہو سکی
شائع اگرچہ سینکڑوں اخبار ہو گئے
دو چار روز بزمِ نگاراں میں بیٹھ کر
کچھ بوالہوس بھی صاحبِ کردار ہو گئے
حد سے بڑھی جو بھوک تو مجبور والدین
اولاد بیچنے پہ بھی تیار ہو گئے
پھر کون طے کرے گا سفر دھوپ کا اگر
ہم بھی رہینِ سایۂ دیوار ہو گئے
تدفین کے لیے ہی سہی مل گئی زمین
مر کر غریب لوگ زمیندار ہو گئے
نصرتؔ میں کیا بتاؤں کہ پیشِ جمالِ یار
میرے حسیں خیال بھی بے کار ہو گئے

نصرت صدیقی/ساہیوال

بات یہ روبرو ہے صاحب سے
شاعری گفتگو ہے صاحب سے
میں تو پوری اسی سبب سے ہوئی
عشق کی آرزو ہے صاحب سے
ہاں محبت نمود ہے میری
مجھ میں ساری نمو ہے صاحب سے
اور جانب یہ اب نہیں اٹھتی
آنکھ کی آبرو ہے صاحب سے
اک روانی سی ہے محبت میں
آنکھ میں آب جو ہے صاحب سے
ورنہ کب کی بکھر گئی ہوتی
چاک دامن رفو ہے صاحب سے

لبنیٰ صفدر/لاہور

ویسے تو بندہ بندہ دشمن ہے
شک محبت کا پہلا دشمن ہے
اس لیے پاؤں اُلٹے پڑتے ہیں
میری منزل کا رستہ دشمن ہے
گھر سے باہر قدم ہے پہلا مرا
دھوپ دشمن ہے سایہ دشمن ہے
آئینے کی طرح ہوں میں شفاف
میرا انداز میرا دشمن ہے
جھونکے کا ہے دیے سے کیا رشتہ
آدھا ہے دوست آدھا دشمن ہے
پیسہ ہی دوست ہے غریبی میں
اور امیری میں پیسہ دشمن ہے
لبنیٰ کیسی معافی اس کے لیے
جو بھی دشمن ہے پورا دشمن ہے

لبنیٰ صفدر/لاہور

غبار کارواں ہونا تمہیں اچھا لگے گا
دعا کا رائیگاں ہونا تمہیں اچھا لگے گا
وہ پیپل جس کے سائے میں طلب کے پھول مہکے
وہی رزق خزاں ہونا تمہیں اچھا لگے گا
خوشی سے میں تو پھولوں کا فصیل نامرادی
تمہارا داستاں ہونا تمہیں اچھا لگے گا
وہ گھر جس میں مہکتی ہے تمہاری یاد برسوں
کبھی صحرا وہاں ہونا تمہیں اچھا لگے گا
جوانی کے سمندر میں ہوں موجیں جوش میں تو
ہوا کا درمیاں ہونا تمہیں اچھا لگے گا
ابھی موسم نہیں بدلا ابھی منظر ہرے ہیں
ابھی سے بدگماں ہونا تمہیں اچھا لگے گا
سلیم عمران سچ پر تہمتیں جب لگ رہی ہوں
زباں سے بے زباں ہونا تمہیں اچھا لگے گا

عمران سلیم/لاہور

ایسا بھی اب نہیں ہے کہ رستہ نہیں رہا
رستے پہ سایا بانٹنے والا نہیں رہا
اے کاش ہو نصیب ساعت کو یہ سدا
میرے وطن میں کوئی بھی بھوکا نہیں رہا
نکلا تھا اُس کا نام ہماری زبان سے
پھر یوں ہوا کہ شہر ہمارا نہیں رہا
سیراب کر رہا تھا جو پیاسوں کی پیاس کو
نقشے پہ اب زمیں کے وہ دریا نہیں رہا
بھیجے ہیں اُس نے پھر مجھے خوابوں کے سلسلے
جب میرا کائنات سے رشتہ نہیں رہا
پتھرا گئیں ہیں آنکھوں میں خوابوں کی تتلیاں
روشن دیے کے نیچے اُجالا نہیں رہا

’’دریچہ‘‘ (اوسلو) قلم قافلہ (اسپین) اور سوشل کلب (عمان) کے زیر اہتمام

آرژنگ

ناروے، اسپین، عمان اور ابوظہبی میں یادگار عالمی مشاعرے

ناروے، سویڈن، جرمنی، اسپین، مسقط اور ابوظہبی کی سیر و سیاحت

محمد ادریس لاہوری، ڈاکٹر ندیم حسین، ارشد نذیر ساحل، ناصر معروف اور ظہور الاسلام جاوید کی ناقابل فراموش رفاقت اور میزبانی

مختلف ممالک کے شعرا سے ملاقاتیں، باتیں اور اجنبی دیسوں کی خوبصورت یادیں ـــــ حسن عباسی

برصغیر پاک و ہند میں مشاعرے کی روایت ہمیشہ مضبوط اور توانا رہی ہے۔ مادیت پرستی کے موجودہ دور میں بھی مشاعرہ اپنے پورے بانکپن کے ساتھ موجود ہے۔ ادبی ذوق کی تسکین اس کے انعقاد کے بغیر ممکن نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اب مشاعرے کی روایت برصغیر سے نکل کر پوری دُنیا میں پھیل چکی ہے۔ سمندر پار کے ممالک میں آباد ہونے والے برصغیر پاک و ہند کے لوگوں نے وہاں ادب کی نئی بستیاں آباد کیں۔ ان میں شاعر، ادیب بھی تھے اور ادب کا ذوق رکھنے والے افراد بھی۔ لہٰذا عالمی سطح پر ادبی تنظیموں کا قیام عمل میں آیا اور دیارِ غیر میں بھی مشاعرے کی روایت مضبوط سے مضبوط تر ہوتی گئی مجھے دُنیا کے مختلف ممالک کے عالمی مشاعروں میں شرکت کے لیے اکثر مدعو کیا جاتا ہے۔ 2017 کا آغاز اس حوالے سے بہت بھرپور رہا ہر ماہ کسی ملک کے مشاعرے میں شرکت کے باعث وطنِ عزیز کی بہت سی اہم ادبی تقاریب میں شرکت نہ کر سکا۔

’’دریچہ‘‘ اوسلو کے زیر اہتمام عالمی مشاعرہ و محفل موسیقی راقم اور ناصر معروف (مسقط) کے اعزاز میں اوسلو

(ناروے) میں منعقد ہوئی جس میں ضمیر طالب نے برطانیہ سے شرکت کی۔ اوسلو کے شعرا علاوہ پاکستانی اور انڈین کمیونٹی کے افراد نے بھی بھرپور شرکت کی۔ بلاشبہ یہ ایک یادگار محفل مشاعرہ تھی جس کی کامیابی کا سہرا منتظمین و عہدیداران دریچہ ڈاکٹر سید ندیم حسین اور محمد ادریس لاہوری کے سر بندھا ہے۔ محمد ادریس لاہوری کے بارے ملتے ہیں یادوں کے بہت سے دریچے کھلتے چلے جاتے ہیں۔ شاعر بھی خوب صورت ہیں اور انسان بھی۔ اوسلو کے شعراء میں فیصل ہاشمی چار شعری مجموعوں کے خالق اور نظم کے باکمال شاعر ہیں۔ آفتاب وڑائچ بھی خوب صورت شاعر اور بہترین دوست ہیں۔ جن شعرا نے اپنا کلام پیش کیا ان میں خالد تھتھال، ارشد شاہین، فیصل ہاشمی، معروف کے ساتھ سویڈن کی طرف سفر بھی یادگار رہا۔ ہمارے اعزاز میں عشائیے اور نجی تقاریب بھی ہوئیں۔ میرے ناروے کے دیگر یادگار مشاعروں کی طرح یہ ٹور بھی ناقابل فراموش رہا۔ ناصر معروف کے ساتھ بائی ایئر جرمنی کے شہر میونخ کی سیاحت زندگی کا ایک نہایت خوش گوار تجربہ تھا میونخ کا شمار ان شہروں میں ہوتا ہے جو اپنے

جرمنی کے شہر میونخ کی سیاحت زندگی کا ایک نہایت خوش گوار تجربہ تھا۔

محمد ادریس لاہوری کے بارے میں تو یہی کہوں گا کہ اُس کا ظاہر اوسلو کی طرح اور باطن لاہور کی طرح خوب صورت ہے۔

میں تو یہی کہوں گا کہ اُس کا ظاہر اوسلو کی طرح اور باطن لاہور کی طرح خوب صورت ہے۔ ان کی محبتوں امیں زندگی بھر مقروض رہوں گا۔ وہ مجھے اپنے بھائیوں کی طرح عزیز ہیں۔ ڈاکٹر ندیم سراپا محبت ہیں۔ بلاشبہ ڈاکٹر ندیم خوبصورت دل کے مالک اور عظیم انسان ہیں۔ ضمیر طالب باکمال شاعر اور ساحرانہ شخصیت کے مالک ہیں۔ ارشد شاہین ہمدمِ دیرینہ ہیں۔ لاہور میں ہم اکٹھے رہا کرتے تھے۔ اب کئی برسوں سے اوسلو میں مقیم ہیں۔ جب بھی مینا جی، آفتاب وڑائچ، ڈاکٹر ندیم حسین، فرح تبسم، سکھ دیو سنگھ، رائے بھٹی، اندرجیت پال، طلعت بٹ، جان دت، اسلم میر، ڈاکٹر ندیم اور ادریس لاہوری شامل ہیں۔ اوسلو میں سات دن قیام رہا۔ زیادہ تر وقت سیر و سیاحت میں گزرا۔ دیارِ غیر میں جہاں حقیقی رشتے بھی منہ موڑ لیتے ہیں وہاں غنیمت ہیں ادریس بھائی اور ڈاکٹر ندیم حسین بھائی جیسے میزبان جو کہ اتنی محبتیں نچھاور کرتے ہیں کہ زندگی خوب صورت لگنے لگتی ہے۔ دونوں دوستوں اور ناصر حسن سے سیاحوں کو اپنا اسیر کر لیتے ہیں۔ اسپین کے شہر بارسلونا میں ہمیشہ کی طرح ارشد نذیر ساحل، راجہ شفیق کیانی، حافظ احمد، راجہ رفیق کیانی اور حفیظ عباسی نے کھلی بانہوں سے استقبال کیا۔ بارسلونا میں ارشد نذیر ساحل کا وجود ادبی حوالے سے کسی نعمت سے کم نہیں۔ بارسلونا کی شاندار ادبی تقاریب ارشد نذیر کی انتھک کوششوں کی مرہونِ منت ہیں۔ قلم قافلہ اسپین اور ریڈیو بارسلونا کے پلیٹ فارم سے ہمیشہ ہی یادگار تقاریب منعقد ہوئیں۔ میں

بارسلونا چوتھی بار مشاعرے میں شرکت کے لیے آیا۔ ناصر معروف اور میرے اعزاز میں یہاں بھی ایک خوبصورت تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ جس میں بارسلونا کے مقامی شعرا ارشد نذیر ساحل، افضال احمد بیدار، عرفان مجید راجا، ارشد عمان، شاہد احمد شاہد، قیس رضوی، نوید بحر کے علاوہ صحافیوں کر مجھے اور ناصر معروف کو بارسلونا کی سیر کرائی اور بطور میزبان محبت دی اُس کے لیے شکریہ کا لفظ بہت چھوٹا ہے۔ ناصر معروف کی یورپ کے سفر میں رفاقت بہت اچھی رہی۔ وہ بہت پیارا دوست اور انسان ہے۔

فروری میں مسقط میں سوشل کلب آف عمان کے ادبی ونگ کے ہیڈ ناصر معروف اور اُن کی پوری ٹیم مبارک اچھے شعر پر دل کھول کر داد دیتے ہیں۔ چند برس قبل بھی میں جس عالمی مشاعرے میں مسقط آیا تھا وہ اسی ہال میں منعقد ہوا تھا۔ مگر یہ مشاعرہ ہر حوالے سے اپنی مثال آپ اور یادگار تھا۔ اس کی کامیابی پر سوشل کلب عمان کے ادبی ونگ کے ہیڈ ناصر معروف اور اُن کی پوری ٹیم مبارک

مادیت پرستی کے موجودہ دور میں بھی مشاعرہ اپنے پورے بانکپن کے ساتھ موجود ہے۔

پاکستان آمد سے قبل ناصر معروف اور مقصود گوہر کے ساتھ مسقط بیچ اور اولڈ سٹی کی سیر و سیاحت نے بہت لطف اندوز کیا۔

اور پاکستانی کمیونٹی کے دیگر افراد نے بھی شرکت کی۔ اس تقریب میں ARY کریمنل موسٹ وانٹڈ کے اینکر علی رضا مہمانِ خصوصی تھے۔ صدارت راقم نے کی جبکہ مہمانِ اعزاز ناصر معروف مسقط تھے۔ حافظ احمد نے ہمیشہ کی طرح نہایت خوبصورت کمپیئرنگ کی۔ یہاں بھی 5 دن قیام رہا اور سیر ہوئی۔ ہمدمِ دیرینہ حفیظ عباسی نے میرے اعزاز میں ہمیشہ کی طرح عشائیے کا اہتمام کیا۔ ارشد نذیر ساحل خوب صورت شاعر اور بہترین دوست ہے۔ اُس نے اپنی بے پناہ مصروفیت میں سے جس طرح وقت نکال

ادبی ونگ نے عالمی مشاعرہ کا انعقاد کیا جس میں پاکستان سے زاہد فخری، راقم اور رُخسانہ سحر شامل تھیں۔ جبکہ بحرین سے ریاض شاہد اور قطر سے فرتاش سید شامل تھے۔ مشاعرہ الفلج ہوٹل میں منعقد ہوا۔ صدارت زاہد فخری نے کی۔ مہمان خصوصی راقم اور مہمانانِ اعزاز فرتاش سید، ریاض شاہد اور رُخسانہ سحر تھیں۔ پاکستانی اور انڈین کمیونٹی نے بھرپور شرکت کی۔ سوشل کلب آف عمان چونکہ کئی سالوں سے یادگار ادبی تقاریب کا انعقاد کر رہا ہے اس لیے سامعین کی ادبی حوالے سے کافی تربیت ہو چکی ہے۔ وہ ہر

باد کی مستحق ہے۔ جس میں سوشل کلب کے عہدیداران چیئرمین میاں منیر، حاجی بوٹا چودھری، عابد مجید، راجہ فضل الرحمٰن بھی مبارک باد کے مستحق ہیں۔ مقبول احمد شیخ اور شکیل بخاری کی نظامت نے مشاعرے کو چار چاند لگا دیے۔

مسقط کے جن شعراء نے اپنا کلام سنایا اُن میں شکیل شہاب، اجمل ساقی، عابد مغل، موسیٰ کشمیری، ذاکر حسین ذاکر، احمد شہزاد، فہیم ضیا، محمد نسیم، عذرا علیم، ناصر معروف، مقبول احمد شیخ اور محمد علی فضل شامل ہیں۔ آخر میں تمام شعرا کو یادگار شیلڈ بھی پیش کی گئی۔

اگلے روز جناب فیاض شاہ جو کہ مسقط کی معروف ادبی، سماجی اور فلاحی شخصیت ہیں، نے اپنے گھر نہایت پرتکلف ظہرانے کا اہتمام کیا ہوا تھا۔ جس میں تمام شعرا

انسان ہے۔ اس ٹور کا حاصل ریاض شاہد سے ملاقات ہے۔ اُن سے مل کر یوں لگا جیسے میں اپنے کسی بچھڑے ہوئے بھائی سے ملا ہوں۔ فرتاش سید قطر میں عالمی

سی خوبیوں اور اوصاف کے باعث مجھے بہت عزیز ہیں اور میرے دل کے بہت قریب ہیں۔ اُس نے اپنی محبت سے تمام مہمانوں، شاعروں کو اپنا گرویدہ بنایا ہوا

بلاشبہ یہ مشاعرے اور دوستوں سے ملاقاتیں میری زندگی کے یادگار لمحات میں سے ہیں۔ جنہیں میں مدتوں فراموش نہیں کر پاؤں گا۔

کے علاوہ سوشل کلب کے عہدیداران بھی شامل تھے۔ فیاض شاہ بہت خوب صورت انسان انتہائی، اخلاق اور کمال میزبان ہیں۔ عابد مغل کے گھر قیام اور اُس کی رفاقت بھی یادگار رہی۔ وہ اچھا شاعر اور دلچسپ

مجلس فروغ اردو اور دیگر تنظیموں کے لیے مثالی ادبی کام کر رہے ہیں۔ ان کی شاعری کا میں شروع سے معترف ہوں اُن کے ساتھ بھی خوب ادبی نشستیں رہیں اور ان سب سے بڑھ کر ناصر معروف جو کہ اپنی بہت

ہے۔ پاکستان آمد سے قبل ناصر معروف اور مقصود گوہر کے ساتھ مسقط بیچ اور اولڈ سٹی کی سیر و سیاحت نے بہت لطف اندوز کیا۔ بلاشبہ یہ مشاعرے اور دوستوں سے ملاقاتیں میری زندگی کے یادگار لمحات میں سے ہیں۔

ابوظہبی کا عظیم الشان سالانہ عالمی اردو مشاعرہ نامور شاعر ظہور الاسلام جاوید کی کوششوں کا مرہون منت ہے۔

بارہواں عالمی اردو مشاعرہ ۹ مارچ ۲۰۱۷ء کو ابوظہبی کے ڈیفنس کلب ہال میں منعقد ہوا اس عظیم الشان مشاعرہ کے منتظم متحدہ عرب امارات کی نامور شخصیت ظہور الاسلام جاوید ہیں وہ ہر سال یہ یادگار مشاعرہ منعقد کرتے ہیں اس بار انہوں نے کمال محبت سے راقم کو دعوت دی مجھے نہایت خوش گوار حیرت ہوئی کہ میری ان سے تقریباً دس سال قبل یو۔اے۔ای کے ہی ایک مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی اس کے بعد کوئی خاص رابطہ نہیں رہا مگر میں ان کے مشاعرے میں مدعو شعراء کے ناموں کی فہرست دیکھتا رہا ہوں انہوں نے ہمیشہ بغیر کسی گروپنگ اور لابنگ کے سو فیصد میرٹ کی بنیاد پر شعراء کو مدعو کیا ہے ان کی اپنی شخصیت باغ و بہار اور شاعری دلپذیر ہے بلاشبہ یہ

مشاعرہ دنیا میں ہونے والے چند اچھے اور بڑے مشاعروں میں سے ایک تھا تقریباً ایک ہزار سے زائد نشستوں کا ہال کھچا کھچ بھرا ہوا تھا بلکہ لوگ جگہ نہ ہونے کے باعث ہال سے باہر بھی موجود تھے۔ مشاعرہ نامور نعتیہ شاعر قاسم پیرزادہ کی صدارت میں منعقد ہوا مہمانِ خصوصی سفیر پاکستان معظم علی خاں تھے گلزار جاوید نے بھارت سے آنا تھا مگر وہ نہ آ سکے راقم کے علاوہ پاکستان سے نثار احمد اور رحمٰن فارس نے شرکت کی جبکہ امریکہ سے ایاز مفتی، بھارت سے اظہر عنایتی، ڈاکٹر کلیم قیصر، علینہ عترت، کنور رنجیت سنگھ چوہان اور زبیر تابش نے شرکت کی متحدہ عرب امارات کے شعراء میں ڈاکٹر زبیر فاروق، ڈاکٹر ثروت زہراء اور ڈاکٹر عاصم واسطی نے اپنا کلام سنایا۔ شعراء میں یادگاری

شیلڈ پیش کی گئیں۔ یو۔اے۔ای کی مختلف ریاستوں سے لوگ اس مشاعرے کو سننے کے لیے آئے۔ میں اپنے دوست پرنس اقبال گورایا کا شکر گزار ہوں کہ وہ مجھ سے ملاقات کے لیے دبئی سے ابوظہبی تشریف لائے وہ خود ایوانِ اقبال دوبئی کے چیئرمین ہیں اور اب تک سینکڑوں یادگار مشاعروں کا اہتمام متحدہ عرب امارات میں کر چکے ہیں۔ معروف شاعرہ کنول ملک بھی دبئی سے خاص طور پر یہ مشاعرہ سننے کے لیے آئیں اور راقم کے علاوہ دیگر شعراء کو اپنا تازہ مجموعۂ کلام ''تمہارے نام'' پیش کیا۔ ظہور الاسلام جاوید کو اس یادگار مشاعرے کے اختتام پر ڈھیروں مبارک باد۔ امید ہے وہ مستقبل میں بھی اسی شوق اور لگن کے ساتھ یادگار مشاعروں کا انعقاد کرتے رہیں گے۔

آتے ہیں تیری یاد کے جھونکے ہوا کے ساتھ
شاہد اکیلے گھر میں اکیلا نہیں رہا

ہمایوں پرویز شاہد/ لاہور

سحر ہونے کو ہے ہائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
کوئی مضمون مل جائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
مجھے اس سلسلۂ عشق کو آگے بڑھانا ہے
نہیں جو یار کہہ پائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
تری زلفیں ترے چہرے لب و رخسار پہ تیرے
اگر تو جلوہ فرمائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
مجھے اُکسا رہا ہے شاعری پہ یہ حسیں موسم
درختوں کے گھنے سائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
سنو چھوٹا سا اب یہ کام کر کے آپ سو جائیں
بنا کر دیں مجھے چائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
کہیں گم ہو گیا ہوں وادیٔ حیرت کی وسعت میں
کوئی میری خبر لائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
میں اب یہ چاہتا ہوں آپ مجھ کو چھوڑ دیں تنہا
تو کیا ہے آپ کی رائے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں
کسی کے پاس آنے سے میری تنہائی بٹتی ہے
کوئی اب پاس نہ آئے مجھے کچھ شعر کہنے ہیں

عرفان اللہ عرفان/ منڈی بہاؤالدین

ہمیں تھے جان سے پیارے ہمارے دل میں رہے
جو چند خواب تمہارے ہمارے دل میں رہے
سو زندگی ہمیں آسان ہو گئی یوں بھی
کہ وہ ہمارے سہارے ہمارے دل میں رہے
وہ اک زمانہ جسے چھوڑے اک زمانہ ہوا
وہ بچپنا وہ غبارے ہمارے دل میں رہے
اُسے کہا ہے کہ وہ ہم سے دور رہنے کی
نذر نیاز اُتارے ہمارے دل میں رہے
اُنہی کے دم سے رہا شاد کام دل اپنا
جو لوگ وقت کے مارے ہمارے دل میں رہے
ہمیں عزیز تھے وہ اور انہیں مفاد عزیز
جو بن کے یار ہمارے ہمارے دل میں رہے
جنہیں جگہ نہیں بستی میں مل سکی کہیں پہ
وہ لوگ سارے کے سارے ہمارے دل میں رہے
ہمارے دل سے ترا آسماں بہت بڑا ہے
سو چند ایک ستارے ہمارے دل میں رہے
فشارِ وقت میں بہہ کر ہوئے ہیں دور مگر
وہ کشتیاں وہ کنارے ہمارے دل میں رہے
جو جیتنے کیلئے جان سے گزر جائے
اگر نصیب سے ہارے ہمارے دل میں رہے

عرفان اللہ عرفان/ منڈی بہاؤالدین

بلندیوں پہ اچانک نصیب آ گیا تھا
میں جب چراغ کی لو کے قریب آ گیا تھا
یہی تو رنج ہے اور رنج بھی بلا کا ہے
وہ دور ہو گیا جو کہ قریب آ گیا تھا
گیا تھا عرش کا باسی زمین زادوں میں
پھر اُس جہان سے ہو کے غریب آ گیا تھا
تبھی وصال کے لمحے فراق جیسے بنے
دل ایک وقت میں دو کے قریب آ گیا تھا
ادب کی دنیا کا دارومدار درد پہ ہے
سو سارا درد سمو کے ادیب آ گیا تھا

ازور شیرازی/ شاہ پور شہر

حریمِ حسن کے لشکر سے آنے لگ گئی ہے
کسی کی یاد برابر سے آنے لگ گئی ہے
میں تیرے ہجر سے وعدہ نبھا نہ پاؤں گا
یہ روز کال جو دفتر سے آنے لگ گئی ہے
نہاتے وقت اچانک جو ڈر گیا ہوں میں
لہو کی موج کیا شاور سے آنے لگ گئی ہے
فضائے شہر پہ موقوف کر نہیں سکتا
جب ایک روشنی اندر سے آنے لگ گئی ہے
تمہاری شاہی کے ہوتے اچھوت جسم کی بو
امیر زادی کے پیکر سے آنے لگ گئی ہے
میں اب خدا کے قبیلے کا فرد ہو گیا ہوں
کہ میری بے خبری گھر سے آنے لگ گئی ہے
خیالِ یار نے تبدیل کر دیے نقطے
کشش جمال کی پتھر سے آنے لگ گئی ہے
چلو کہ ڈھلتے سورج کے ساتھ ڈوب چلیں
صدائے قرب سمندر سے آنے لگ گئی ہے

ازور شیرازی/ شاہ پور شہر

ہنر سے استفادہ کر لیا ہے
اُداسی کو لبادہ کر لیا ہے
چراغوں کو بجھا کر دل جلایا
جدا ہو جائیں چل پھر ہم خوشی سے
اگر تو نے ارادہ کر لیا ہے
نہیں بدلی روش اُس بے وفا نے
ہمی نے دلکشادہ کر لیا ہے
تمہارے خواب تم کو کر کے واپس
حسیں نیندوں کو سادہ کر لیا ہے
مجھے رسوا ہوا نے اور تم نے
جہاں میں کچھ زیادہ کر لیا ہے

وہ شیشہ عکس جس میں تھا تمہارا
لو ہم نے خود برادہ کر لیا ہے
دعائیں رائیگاں ہوتے ہی شاقی
دکھوں کو ہم نے جادہ کر لیا ہے

عقیل شاقی/لاہور

غرقِ نشاط تھے غفلت نے آ لیا
مسکن تھا اوج پر رخصت نہ آ لیا
گرنے پہ آئے تو گرتے چلے گئے
ایسا زوال تھا حسرت نے آ لیا
مٹتی نہیں ہوس حاکم کی رات دن
دائم غریب کو غربت نے آ لیا
رکھتا تھا شاہ وقت اتنی منافقت
مکر و فریب کی فطرت نے آ لیا
نقارہ جب بجا یاں احتساب کا
اہل وطن کو بس حسرت نے آ لیا
کلفت بھی مٹ گئی تنہائی بھی گئی
رب کے خیال سے فرحت نے آ لیا
انمول موتی کیا ہم نے گنوا دیے
دل کو زیاں کی اس شدت نے آ لیا
دنیا میں اپنی تو مہلت ہوئی تمام
ہے شام زندگی ساعت نے آ لیا
کرتا ہوں ذکرِ رب اشکوں سے میں مدام
مسعود نیم شب لذت نے آ لیا
لوگوں کے کام تو مسعود تھے سعید
اخلاق کیا ملا خدمت نے آ لیا

خالد مسعود/لاہور

حسن و شباب کی نزہت نے آ لیا
قرب و گداز کی فرحت نے آ لیا
خواب و خیال کی راحت نے آ لیا
دل کو حسین سی ساعت نے آ لیا
ملکوتی حسن کی مورت نے آ لیا
اک طلسمی بہت صورت نے آ لیا
شعر و سخن کی جب الفت نے آ لیا
چہرے کی اک مجھے چاہت نے آ لیا
اک جادوئی ادا قربت نے آ لیا
مستی شباب کی رفعت نے آ لیا
اک سادہ حسن کی آیت نے آ لیا
رخسار و لب کی پھر مدحت نے آ لیا
پیکر نزاکتوں کا وہ جو آ گیا
گھر کو مرے تو پھر زینت نے آ لیا
آئے وہ کہنے جب کل شام الوداع
دیکھا جو آنکھوں میں حسرت نے آ لیا
اک پل میں ہو گیا تیرا غرور پاش
جذبات کی تمہیں شدت نے آ لیا
دلکش کلام بھی دلکش فنی کے ساتھ
رعنائی حسن کو عشرت نے آ لیا
مثل گلاب خود مثل صبا ادا
مہکے شباب کو نکہت نے آ لیا
اک حشر چار سو قامت وہ فتنہ ساز
اس پر گھٹاؤں کی سطوت نے آ لیا
ہر ہر قدم اسے مستی خرامِ ناز
محشر کو اک نئی رفعت نے آ لیا
تم کم سنی میں بھی دکھتے رہے غضب
شانِ شباب میں شوکت نے آ لیا

آیا سلام جب نظروں کا بزم میں
وارفتگی کی پھر ساعت نے آ لیا
وہ رہ گئے ٹھٹھک دیکھا جو میرا حال
جذبات کی انہیں شدت نے آ لیا
وہ چاند دیکھنے آئے جو عید کا
مہتاب سی حسیں ساعت نے آ لیا
تم روبرو بھی ہو اور گفتگو بھی ہو
پیاسی نظر جرأت نے آ لیا
کچھ محویت سے یوں دیکھا کیے ہمیں
ہم کو بھی عالم حیرت نے آ لیا
قربت کی گرمی سے دہکا مرا وجود
اس کو بھی ایک دم حدت نے آ لیا
میرا نصیب تو سب پوچھتے ہیں لوگ
تیرے حوالے سے قسمت نے آ لیا
جلووں کی پہلی وہ برسات کر گئے
پھر مسکرائے تو دولت نے آ لیا
ہیں سامنے وہ یوں جیسے کہ حشر ہو
کشش بھی کم نہ تھی قامت نے آ لیا
رفعت خیال کی حسنِ بیان بھی
رنگِ غزل غضب ندرت نے آ لیا
بکھرے قدم قدم چہرے حسین تھے
مسعود ہر قدم مورت نے آ لیا
اس مست آنکھ نے مسعود کیا کہا
پھر مئے کدوں کو سب آفت نے آ لیا

خالد مسعود/لاہور

یوں بھی مشکل کو میں آسان بنا لیتا ہوں
درد کی لہر کو مسکان بنا لیتا ہوں
جب بھی طوفان مری ناؤ ڈبونے آئے
چند لہروں کو نگہبان بنا لیتا ہوں
میرے قاتل کی طرف دیکھتا کوئی بھی نہیں
میں تو مرتے ہوئے پہچان بنا لیتا ہوں
اکثر اوقات خیالات کی آویزش میں
ذہن کو جنگ کا میدان بنا لیتا ہوں
ہارتے ہارتے آ جاتا ہوں اُس منزل پر
جیتنے کا جہاں امکان بنا لیتا ہوں
وقت تدبیر کا ملتا ہی نہیں شمس مجھے
بات کو بات کے دوران بنا لیتا ہوں

زاہد محمود شمس/ ملتان

کیا ہوا کیوں لوگ دشمن ہو گئے
شاید اب اپنے مقدر سو گئے
راہ پر ڈالا تھا میں نے ہی جنہیں
کیوں وہ کانٹے میری راہ میں بو گئے
رات بھر جاگے ستارے میرے ساتھ
صبح ہوتے ہی وہ سارے سو گئے
اک زمانہ جذب ہم میں ہو گیا
آپ کی یادوں میں جب ہم کھو گئے
دھیرے دھیرے مل گیا دل کو سکوں
ہوتے ہوتے وہ ہمارے ہو گئے
رات کو جاوید کتنے ہی نجوم
مثلِ شبنم میرے غم میں رو گئے

جاوید صدیق بھٹی/ لاہور

بظاہر مرے ساتھ سایہ نہیں تھا
مرے ساتھ گھر تھا میں تنہا نہیں تھا
رقیبوں میں دیکھا اُسے مسکراتے
مری بے بسی پہ وہ رویا نہیں تھا
اُسے اس لیے میں نہ بھایا کبھی بھی
ے درد میں وہ سمویا نہیں تھا
اُسے، اُس کی طاقت ہے کیا جانتا ہوں
کہ گرجا بہت تھا وہ برسا نہیں تھا
لگا تھا اُسے ہے کئے پر ندامت
پلٹ کر تو دیکھا، وہ پلٹا نہیں تھا
مرے دل کے اندر تھیں ساگر کی لہریں
مگر آنکھ سے اشک ٹپکا نہیں تھا

صدام ساگر/ گوجرانوالہ

تیرے دل تے اُتر چکا ہوں میں
ایسا لگتا ہے مر چکا ہوں میں
اب مجھے کس طرح سمیٹو گے
ریزہ ریزہ بکھر چکا ہوں میں
تیری بے اعتنائیوں کے سبب
ظرف کہتا ہے بھر چکا ہوں میں
تجھ کو ساری دُعائیں لگ جائیں
اب تو جینے سے ڈر چکا ہوں میں
ایک غم اور منتظر ہے مرا
ایک غم سے گزر چکا ہوں میں
تجھ کو نفرت سے ہی نہیں فرصت
چاہتوں میں سنور چکا ہوں میں
آئنہ اب نہیں ہے گرد آلود
رہ چکا ہوں، نکھر چکا ہوں میں
خود سے لڑنا بہت ہی مشکل ہے
تیری خاطر یہ کر چکا ہوں میں
اب تو باہر نکال پانی سے
دیکھ اب تو اُبھر چکا ہوں میں

عمران شناور/ لاہور

ہمیں تم سے ملے اب تو نجانے کتنے جگ بیتے
تمہیں بھی گردشِ حالات نے بدلا تو کچھ ہوگا
کئی چرکے دلِ نازک پہ اپنوں سے لگے ہوں گے
وفا کی راہ میں شاید کئی دھوکے ملے ہوں گے
لکیروں نے عجب اک جال چہرے پر بنا ہوگا
زمانے بھر کی فکروں نے تمہیں کھلا دیا ہوگا
تمہاری سرمئی آنکھوں پہ اب عینک دھری ہوگی
میری تصویر بھی تو اُس میں دُھندلی پڑ گئی ہوگی
اچانک آئینے میں جب سے میں نے خود کو دیکھا ہے
اسی پل سے یہ اندیشہ سا میرے دل میں اٹکا ہے کہ
تمہیں بھی گردشِ حالات نے بدلا تو کچھ ہوگا

تسنیم کوثر/ لاہور

میں نے جب ممنوعہ مٹی کو چھوا
پھر بدن سرسبز میرا ہو گیا
پھر انوکھی طاقتیں آنے لگیں
پھر انوکھا واقعہ ہونے لگا
پھر مجھے بے وقت نے آواز دی

اور میں بے جان مٹی سے اُٹھا
روشنی کس سمت سے آنے لگی
جل رہا ہے میرے کمرے میں دیا
جب ہماری آنکھ بھی رونے لگی
پھر ہمارا خواب بھی رونے لگا
میرے بس کی بات یہ ساجدؔ نہیں
میں محبت کر چکا ہوں بارہا

تسنیم کوثر/ لاہور

دسمبر لوٹ آیا ہے......!

مری درزوں کی کرنوں پر
ہراساں وقت کے آنچل کا سایہ ہے
اُسے کہنا
دسمبر لوٹ آیا ہے
سحر شب دُھندآنکھوں میں اُترتی ہے
مری پلکوں پہ بادل سے سمت آنے سے کچھ پہلے
سنورتی ہے نکھرتی ہے
وہ موتی بن کے آنکھوں میں بکھرتی ہے
ہراساں وقت کے در پہ یقیں گم، چشم حیراں، التجا
آنکھوں میں ہونٹوں کو ہے وہ یاس کے گمنام اور
تاریک سے آلام کی یورش میں پتھر رنگ، رنگ سنگ،
ٹوٹی راہداری اور شکستہ سیڑھیاں......
مولا مرے مولا!
ہراساں وقت کے کیسے محل ہیں یہ؟
سوالی پھر یقیں گم، چشم حیراں، یوں مخاطب ہے
”مرا سورج، جو میرے برف پیکر کو ذرا چھو کر مجھے
الماس کر دیتا
مری سوچوں پہ چھایا ہے
کہو جا کر اُسے کہہ دو وہ لوٹ آئے
دسمبر لوٹ آیا ہے......
اُسے معلوم؟
اُس کے بن یہاں یادوں کے درباروں کے گنبد کس
طرح ساون کی چاندی بارشوں کے نرم گالوں سے
اُلجھتے ہیں؟
بھلا ریشم کی تاروں سے بنے سپنے بنا اُس کے سلجھتے ہیں؟
صبا جائے......!
اگر وہ خود
نہیں آتا تو اُس کے ہاتھ کی لکھی کوئی تحریر لے آئے
کہے اُس سے
وہ اب کی بار آئے تو کوئی تعبیر لے آئے
کوئی تو ہو ہراساں وقت کے زنداں کی درزوں میں
ذرا تنویر لے آئے
جو سمجھے کیوں شفق کی جستجو کرتے سحر کا گھر جلایا ہے
کوئی جا کے کہے اُس سے وہ لوٹ آئے
دسمبر لوٹ آیا ہے......!
دسمبر پھر نہ آئے گا
دسمبر پھر نہ آئے گا

عدنان سعید/

چلی آتی ہے

دن گزرتا ہے تو پھر شام چلی آتی ہے
شام جاتی ہے تو پھر رات پہرا گہرا
رات کا پہرا میرے خواب چرا لیتا ہے
مجھ کو دُنیا سے چھپا دیتا ہے
سوچ کی تتلیاں اُڑتی رہیں ہیں مگر
پوروں پہ رنگ ہیں اور رنگ بھی پھیکے ہوتے
میرے حصے کے مقدر کو سیاہ کرتے ہوئے
لوگ ایسے بھی جیا کرتے ہیں
ارے احسان فراموش
تم محبت کو مقدر تو بنا کر دیکھو
رنگ ہی رنگ ہیں خوشبو ہے نرالی اس کی
پھول ہی پھول نظر آتے ہیں پھر حلیہ دل میں
اپنی آنکھوں سے ذرا پردہ تمیں اُٹھا کر دیکھو
ایک مسکان چلی آتی ہے دہلیز تلک
روشنی بڑھتی چلی جاتی ہے دیواروں پہ
بقیہ نور بنا بیٹھا ہے ہر کونہ گھر کا
کھڑکیاں تال پہ تال
جھومتے گاتے پردے
کیسی سرگوشی ہوا کرتی پھرے کانوں میں
رنج کا مسکن ہے یہ دل، رنج اُتارے اپنے
کوئی آئے گا ذرا نین سنوار مرے اپنے
گوندھ کر کلیاں حسین زُلفوں میں
آرزو خوشبو لیے ساتھ چلی آتی ہے
دُکھ کے روزن میں سجائے ہوئے خوابوں کا جہاں
دن گزرتا ہے تو پھر شام چلی آتی ہے
درد کا ساز لیے بے نام چلی آتی ہے

آسناتھ کنول/ لاہور

ایک بادشاہ تھا

وحید قندیل

بچپن سے میں نے دادی، نانا، نانی، استادوں اور بزرگوں سے کئی کہانیاں قصے سنے ہیں۔ بیشتر قصے صرف من گھڑت ہوتے تھے اور بیشتر ان میں سے ماضی یا زمانہ قدیم میں گزرے ہوئے واقعات پر ہوتے تھے۔ جن کا مرکزی عنوان یا کوئی بادشاہ، شہزادہ، شہزادی یا پھر کوئی پری ہوتی تھی۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ میرے نانا جی مجھے بے شمار بادشاہوں کے قصے سنایا کرتے تھے جن میں سے مغلیہ دور حکومت میں اکبر بادشاہ سرفہرست رہتا تھا۔ بعض اوقات شاہ جہاں، اورنگ زیب، بابر اور بہادر شاہ ظفر بھی زیر بحث ہوتے تھے۔ مختلف بادشاہوں کے عروج و زوال کے قصے مجھ کو سناتے تھے۔ کئی بڑے سبق آموز بھی ہوتے تھے اور کئی عقل سے ماورا یا من گھڑت حقائق پر بھی مبنی ہوتے تھے۔ بہرحال وقت گزارنے اور مجھے بہلانے کے لیے جو کچھ ان کو تاریخ سے علم میسر تھا، مجھ تک منتقل کر دیتے تھے اور ہر قصے کو سناتے ہوئے ان کا پہلا جملہ ہمیشہ ایک ہی ہوتا تھا۔ کسی زمانے میں ایک ملک کا ''ایک بادشاہ تھا'' جس کی حکومت فلاں سے فلاں دور تک اس جگہ سے اس جگہ تک اس نسل سے اس نسل تک تھی وغیرہ وغیرہ۔

پھر کبھی عروج کبھی زوال کبھی ان کی فتوحات کبھی ان کی شکست پر ایک لمبی تفصیل ہوتی تھی۔ قصے کا انجام کسی اچھے یا برے واقعہ پہ اختتام ہو جاتا تھا۔ مگر اتفاق سے ان سارے بادشاہوں میں سے کسی ایک بادشاہ کو نہ میں دیکھا تھا نہ سنا تھا اور نہ ہی اس کے اعمال سے میری آشنائی تھی۔ بس قصے کی حد تک ایک کردار رہ جاتا تھا۔

زمانہ قدیم سے آج تک فرعون سے لے کر موجودہ ہر بادشاہ تک کا ایک اپنا دور حکومت رہا ہے۔ کہیں کسی نے حکومت کو سنبھال کے مملکت کی فلاح و بہبود میں عمر صرف کر دی اور کہیں کسی نے ملک و مملکت کا بھیڑ ظلم و ستم سے بحر ظلمات میں ڈبو دیا۔

بہرحال بہت زیادہ تعداد میں بادشاہ سخت مزاج، تند خو، جابر طبع اور رعونت پسند ہوا کرتے تھے۔ چند ہی تاریخ میں ایسے بادشاہ گزرے ہیں جن کی زندگی ان کی مملکت کی فلاح و بہبود میں گزری اور وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گئے۔

اللہ بادشاہ

یہ حقیقت ہے کہ اس پیاری سے خداوند کریم کی کائنات میں سب سے بڑا بادشاہ اللہ ہی ہے۔ جس کی ہر چیز پر حکومت ہے جو ہر شے کا مالک ہے۔ دن رات، زمین آسمان اور اس کل کائنات کے زیر زبر کا جس نے اسے تخلیق بھی کیا اور جس نے اسے آباد بھی کیا اور جو اس پر رہنے والوں کے لیے ہر ایک پر محبت، رحمت برساتا رہتا ہے۔

اُسی اللہ بادشاہ نے اپنی اس پیاری زمین میں روز اوّل سے گاہے گاہے ہر دور میں کئی انسانوں کو دوسرے انسانوں پر پیشوا یا سربراہ قائم کیا۔ اور اس پیاری سی کائنات کے کسی نہ کسی کونے میں اقتدار بخش کے اک عرصے کے لیے بادشاہت عطا کر دی۔ بادشاہت سے مراد ہر سیاہ سفید ہر بنی نوع انسان ہر شے کا دنیاوی مالک ہو جانا مراد ہے۔ ''یعنی سب کچھ ایک ہی شخص کی دسترس میں ہو جاتا۔'' کچھ لوگ بادشاہوں اس رتبے یا اس آزمائش میں اچھے اور نیک رہے مگر بہت سے ظالم، قاتل، جابر اور حق تلف بن گئے۔

ہم نے بہت سے بادشاہ تو نہیں دیکھے مگر آج بھی جہاں دنیا میں کئی ممالک میں جمہوریت، آمریت ہے وہیں کہیں کہیں بادشاہت بھی اپنا حسن دکھاتی رہتی ہے۔

میرے نانا کے قصوں کے بادشاہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہے مگر میرے دور میں کئی بادشاہوں میں ایک بادشاہ ایسا بھی ہے جس کے 88 سالہ عمر کے آخری 18 سالوں کا دور میری آنکھوں کے سامنے تصویر کی طرح گزارا اور اس دور کی حقیقت دیکھ کے 88 سال کے اس بادشاہ کی زندگی سے مجھے کافی رغبت ہوئی یہ کوئی اور نہیں تھائی لینڈ کا موجودہ بادشاہ ہے جس نے تھائی لینڈ پر بادشاہت کی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے امر ہو گیا۔

تاریخ کے اوراق سے

Bhumibol Adulyadej (Rama ix) = تھائی لینڈ کی بادشاہت میں 9ویں نمبر کا یہ بادشاہ ''بھومی بھل آدھیا دیج''

جسے تھائی زبان میں ''پھومی پھنگ Phumiphon'' بھی کہتے ہیں۔ 5 دسمبر 1927ء کو امریکہ میں اس وقت کے بادشاہی جوڑے شہزادے Mahidol اور شہزادی Adulyadej Srinagavindra کے گھر پیدا ہوئے جن کی شادی امریکہ میں 1920ء میں ہوئی تھی۔

شہزادہ اس وقت امریکہ میں میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہا تھا جب اس کی ملاقات شہزادی سے ہوئی اور دونوں ہی رشتہ ازدواج میں منسلک ہوگئے۔ ''پھومی پھنگ'' کے والدین شہزادہ اور شہزادی کے گھر تین بچوں کی پیدائش ہوئی۔ 1923ء میں بیٹی 1925ء میں بڑے بیٹے اور 1927ء میں دوسرے بیٹے کی پیدائش ہوئی جو کہ پھومی پھنگ تھا۔ میڈیکل کالج سے تعلیم کے بعد اپنے تین بچوں کو لے کر یہ شاہی جوڑا تھائی لینڈ اُس وقت کی مہارانی جو شہزادے کی ماں تھی اُس کے پاس لوٹ کے 1928ء کو امریکہ سے آگئے۔ مگر ایک سال بعد 24 ستمبر 1929ء کو شہزادے کی موت کڈنیاں فیل ہونے سے واقع ہوگئی۔ اس وقت پھومی پھنگ کی عمر صرف 2 سال تھی۔ 29 سالہ شہزادی اپنے تینوں بچوں کے ساتھ بیوہ چند عرصے کے بعد دوبارہ تھائی لینڈ سے سوئٹزرلینڈ چلی گئی۔ جہاں تینوں بچوں کی تعلیم شروع ہوئی اور آہستہ آہستہ بڑے ہوتے گئے۔

دوسری جانب تھائی لینڈ کے اس وقت کے بادشاہ "King of Siam" پراجادیپک (Prajadhipok) جو تھائی لینڈ کے 7ویں بادشاہ تھے اور انگلینڈ میں رہا کرتے تھے۔ ان کے گھر کسی بیٹے کی پیدائش نہ ہونے کی صورت میں آٹھویں بادشاہ کا تاج مرنے والے شہزادے کے دو بیٹوں میں سے بڑے بیٹے "Prince Ananda Mohidol" کے سر آیا جو پھومی پھنگ کا 2 سال بڑا بھائی تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف 9 سال تھی۔

شہزادی یعنی پھومی پھنگ کی ماں ان تینوں بچوں کو لے کر تھائی لینڈ چلی آئی جہاں 9 سالہ بیٹے کے سر پر بادشاہت کا تاج رکھا گیا اور سیام کی عوام نے اپنے کم عمر اور نئے شہزادے کو مستقبل کے بادشاہ کے روپ میں دیکھا اور دل و جان سے تسلیم کرلیا۔

بعد ازاں شہزادی کے اسرار پہ حکومت نے پھر بچوں سمیت سوئٹزرلینڈ جانے کی اجازت دے دی۔ تاکہ وہ اپنی مزید تعلیم یورپ میں مکمل کرسکیں اور شہزادی کی منشا کے مطابق ایک نارمل فیملی کے بچوں کی طرح تینوں بچے بڑے ہوسکیں جن میں 9 سالہ ولی عہد بھی شامل تھا۔ شہزادی نے سوئٹزرلینڈ میں سکونت اختیار کرلی اور بچوں کو تعلیمی سرگرمیوں میں مصروف رکھا۔ جہاں پھومی پھنگ اور اس کے بھائی (ولی عہد) دوستوں کی طرح بڑے ہوئے۔ ساتھ پڑھے اور زندگی کے لطف و اکرام سے مستفید ہوتے گئے۔

9 جون 1946ء کو آخر شہزادی بچوں کو لے کر واپس تھائی لینڈ (سیام) چلی آئی اور بڑے بیٹے نے کم عمری میں ہی بادشاہت سنبھالی مگر 1935 سے 1946 تک کے گیارہ سال ہی کا اقتدار تھا اور سوئٹزرلینڈ سے واپسی کے 9 ماہ بعد اچانک ایک دن کمرے میں شہزادے کی پُراسرار موت گولی لگنے سے ہوئی اور اس طرح موجودہ تھائی لینڈ کے آٹھویں بادشاہ بھی اس جہانِ فانی سے رُخصت ہوگیا۔ 19 سالہ جوان بادشاہ کی موت سے جہاں تھائی لینڈ نے اپنے بادشاہ کو کھویا وہیں پھومی پھنگ نے اپنے بڑے بھائی اور ایک اچھے دوست کو بھی گنوا دیا۔

ٹھیک اُسی دن 9 جون 1946ء کو بادشاہت کا تاج موجود تھائی لینڈ کے بادشاہ ''پھومی پھنگ'' یعنی چھوٹے بیٹے کے سر پہ آگیا۔

King Rama ix

پھومی پھنگ تھائی لینڈ کے بادشاہی سلسلہ چکری ڈنسٹی (Chakri Dynasty) کے نویں بادشاہ ہیں۔ 1946ء کے بعد تھائی لینڈ کی سلطنت کا یہ بادشاہ نہ صرف بادشاہ بنا بلکہ لوگوں کے دلوں پر بھی حکومت کرنے لگا۔ اپنی مٹی اور اپنے لوگوں سے گھل مل کے محنت کو اپنا نصب العین سمجھ کر بدھ مت کی تہذیب کا علمبردار بنا۔ پھومن پھنگ نے 1946 کے چند سال بعد فرانس میں اُس وقت کے تھائی امبیسیڈر کی بیٹی سے 5 مئی 1950ء کو Sirikint Kitiyakara نامی سے شادی کرلی۔ جن کا سلسلہ بھی بادشاہی گھرانے سے منسلک تھا۔ اور اب تک یہی تھائی لینڈ کی کوئین ہے۔ پھومی پھنگ کے ہاں چار بچے پیدا ہوئے۔ جن میں تین بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے جس کا نام Maha Vajira Longkorn ہے۔ یہ ولی عہد یا پرنس 64 سال کی عمر کا پھومی

پھٹنگ کے بعد تھائی لینڈ کا اگلا بادشاہ یعنی King Rama X کہلائے گا۔

پھومی پھٹنگ کو شروع سے ہی آرٹ، ڈرائنگ اور مٹی کے کھلونے بنانے اور میوزک میں ماہر ہونے کا اعزاز حاصل ہے۔ وہ میوزک کے دلدادہ رہے ہیں اور ایک زمانہ قدیم میں ایک میوزک البم بنانے کا اعزاز بھی حاصل ہے۔ اور یہی وجہ ہے فنون لطیفہ سے رغبت ان کی اصل زندگی میں بھی جھلکتی رہی۔

تھائی لینڈ میں کئی موقعوں پر مختلف حالات رونما ہوتے رہے مگر پھومی پھٹنگ نے ایک ہی موقف سامنے رکھا۔ اپنی قوم سے محبت، شفقت، پیار اور بدھ مت کی تہذیب کو اصول زندگی اور اپنے دیس کی فلاح و بہبود کے لیے ہر ممکن کوشش جوں جوں وقت گزرتا گیا حالات زیر زبر ہوتے رہے۔ وہیں پھومی پھٹنگ بھی تھائی لینڈ کے شاہی رتبے پہ اپنا جلوہ کسی فرشتے کی طرح دکھاتا رہا۔

1994ء میں جب تھائی لینڈ میں وزیر اعظم کے خلاف جلسے جلوس شروع ہوئے اور ملک کے حالات حد سے زیادہ خراب ہونے لگے۔ 4 دن کا ملٹری کریک ڈاؤن ہوا اور سیاسی بحران کی وجہ سے سول وار کا خدشہ منڈلانے لگا اور قوم بہت بڑے انتشار کا شکار ہونا شروع ہوگئی۔ وزیر اعظم کا اقتدار نہ چھوڑنا اور دوسری جانب احتجاج کرنے والے گروپ کی توڑ پھوڑ سے بنکاک شہر ایک جنگ وجدل کا مرکز بن گیا۔

تھائی لینڈ میں بادشاہ کوئی سیاسی طاقت یا مداخلت نہیں رکھتا۔ اسے بس ہیڈ آف دی کنٹری سمجھا جاتا ہے جبکہ وزیر اعظم ہیڈ آف گورنمنٹ اور چیئرمین آف دی کیبنٹ آف تھائی لینڈ کہلاتا ہے۔ بادشاہ کی شبیہہ یہاں خدا جیسی ہے۔ یہ لوگ بادشاہ کے عکس کو عکس ربانی سمجھتے ہیں۔ تاہم پھومی پھٹنگ کے ایک اشارہ پر سب امن میں تبدیل ہوگیا۔ اور ایک ہی محبت بھرے پیام نے پھر سے ملک کو دو حصوں میں بٹنے سے بچالیا اور تمام سیاسی معاملات بحث کے ذریعے طے کیے گئے۔

<u>ہر سو اُسی کو جلوہ نما دیکھتا ہوں میں</u>

تھائی لینڈ کے کسی کونے یا کسی شہر میں چلے جائیں۔ ائیر پورٹ سے لے کر جنگل میں کہیں ایک آدھی ٹوٹی پھوٹی سی دکان تک آپ کو ہر کہیں ایک ہی شخص کی تصویر نظر آئے گی۔ ائیر پورٹ سے لے کر ٹرین اسٹیشن اور ملک میں بنی ہوئی ہر بڑی عمارت یا دکان اُس وقت تک آغاز نہیں ہوسکتی جب تک بادشاہ کی تصویر اکیلے یا کوئین کے ساتھ دیوار پہ نہ لگی دکھائی دے۔

تھائی کرنسی کے سبھی نوٹوں یعنی بھات پر اسی بادشاہ کی تصویر ہے جبکہ ہر بڑے سرکاری اعزاز یا عمارت کے باہر بھی!

لوگ اس قدر اپنے بادشاہ سے محبت کرتے ہیں کہ سڑک پہ کہیں کاغذ گر جائے تو اٹھا کے احترام سے اوپر رکھ دیتے ہیں جس پر اس بادشاہ کی تصویر ہو۔

تھائی کرنسی پہ پاؤں رکھنا یا شاہی خاندان کے کسی فرد یا بادشاہ کے بارے میں برا کہنا منع ہے۔ بادشاہ یا بادشاہ کے خاندان کی بے حرمتی پر 7 سے 15 سال کی سزا ہوسکتی ہے۔

مجھے یاد ہے جب میں پہلی بار 1999ء میں تھائی لینڈ گیا تھا تو ہر جگہ بادشاہ کی تصویر دیکھ کے حیران تھا۔ کہ یہ کیسے لوگ ہیں کہیں کی دوسرے شخص یا وزیر اعظم کی اتنی تصویریں نہیں دکھائی دے رہیں۔

حتیٰ کہ کبھی کبھار جب بادشاہ کا قافلہ کاروں کی صورت میں بنکاک کے کسی سڑک سے گزرتا تھا یا گرینڈ پیلس کی جانب جاتا تھا تو پولیس سڑک پر ٹریفک روک دیتی تھی۔ ہم بھی کنارے پر کھڑے ہو کر قافلہ گزارنے کا انتظار کرتے تھے۔ جونہی بادشاہ کا قافلہ قریب سے گزرتا تو سڑک کی دونوں جانب ہر عمر کے لوگ بادشاہ کے احترام میں گھٹنوں کے بل ہو جاتے تھے۔ یا سر خم کر دیتے تھے حتیٰ کہ سڑک کنارے فقیر یا مانگنے والے جو اُٹھ بھی نہیں سکتے تھے وہ بھی ہاتھ جوڑ کے احترام سے جھک کے گاڑی کی طرف سلام پیش کیا کرتے تھے۔ میں کافی حیرت سے دیکھتا رہتا تھا کہ یہ کیسے لوگ ہیں جو بادشاہ کی گاڑی جس میں وہ شاید باہر ایک جھلک بھی اُن کو نہ دیکھ رہا ہو مگر یہ اس کے احترام میں اتنے سنجیدہ ہیں۔

تھائی لینڈ میں آنے والے سیاح بھی شروع شروع میں کافی تذبذب میں رہتے ہیں لیکن عموماً ہر مغربی ملک کے سیاح کو تنبیہ کی جاتی ہے کہ وہ شاہی خاندان بالخصوص بادشاہ کا احترام کریں اور کسی قسم کے غلط جملے یا لفظ کا استعمال نہ کریں۔ ورنہ اس کے ضمن میں سزا پہ آپ کو کوئی بھی معاف نہیں کرواسکتا۔

مزے کی بات یہ ہے کہ سیاح بھی جو متعدد

بار یہاں آ چکے ہوتے ہیں۔ اس بادشاہ کے بارے کبھی برا نہیں کہتے۔ وہ اس قوم کو احترام کرتے دیکھ کو خود بھی احترام کرنے لگ جاتے ہیں۔

کوئی فقیر، بھکاری ہو یا درمیانی درجے کا شہری ہو۔ امیر ہو وزیر ہو چاہے جس رتبے یا حیثیت کا مالک ہو وہ بادشاہ سے اتنی ہی محبت کرتا ہے جتنی ایک محبت کرنے والے کا حق ہوتا ہے۔

2014ء کے بعد بادشاہ کی صحت حد سے زیادہ خراب ہونا شروع ہو گئی تھی۔ تاہم اسے اسی Siriraj Royle Hospital میں دوبارہ علاج کے لیے لایا گیا۔ جہاں 2012ء میں کروز کے سفر کے دوران ہمیں بتایا گیا تھا۔ آخر ہر کسی کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ شاہ ہو کہ گدا اس جہان فانی سے رخصت ہوتا ہی ہے۔ بھومی پھنگ آج سے دو ماہ قبل 88 سال کی عمر میں بنکاک کے سیری راج رائل ہسپتال میں میں 13 اکتوبر 2016ء کو انتقال کر گئے اور آخر تھائی لینڈ کے شاہی سلسلے میں The Longest Rulling Monarce کا اختتام ہو گیا۔ بھومی پھنگ کی 88 سالہ عمر میں 70 سال کے قریب یعنی 69 سال 92 دن بادشاہت رہی۔

The longest reigring monorch in Thai history

دلچسپ حقائق یہ ہیں کہ ان 70 سالوں میں بھومی پھنگ نے نہ کوئی جنگ لڑی ہے نہ کسی سلطنت سے ملک پر حملے کا خوف رہا۔ نہ تلوار نہ بندوق کے زور پر کسی حصے کو فتح کیا گیا۔ نہ ہی کسی قسم کا خون بادشاہت کی خاطر بہایا گیا۔ اور اس کی بادشاہی دور میں قریب 30 وزیر اعظم تبدیل ہوئے۔

دوسرے بادشاہوں کے ظلم و جبر اور دیواروں میں چنوا دینے والے واقعات پر بھی تاریخ یہاں خاموش نظر آتی ہے۔ نہ کسی کے منہ پر بادشاہ کے خلاف ظلم کا شکوہ، نہ بغاوت کی بو دکھائی دی۔ بلکہ جہاں لوگ بادشاہوں کے مرنے پہ خوش ہوتے ہیں جشن مناتے تھے اور ظلم سے چھٹکارا پاتے تھے۔ وہیں تھائی لینڈ میں لوگ اس کے برعکس رو رو کے نڈھال ہونے لگے تھے۔ یہ بات بھی قابل غور ہے کہ بادشاہ 88 سال کی عمر پانے کے بعد مرا ہے لیکن لوگوں کے لیے یہ بات بھی غور طلب نہیں رہی۔ بلکہ بہت سے لوگ اسے Father Figer سمجھ کے باپ کے پیار سے خود کو محروم سمجھنے لگے۔

عموماً سوگ کے طور پر اکثر لوگ سیاہ پٹی باندھ کے ماتم مناتے ہیں لیکن تھائی لینڈ میں لوگ سیاہ رنگ کے کپڑے پہن کے سوگ مناتے رہے۔ ہر آنکھ اشکبار تھی۔ تھائی قوم کے علاوہ یہاں بسنے والے مسلمان یا ہجرت کر کے آنے والے ہندو اور سکھ جن کا تعلق تھائی لینڈ سے مستقل یا عارضی ہے۔ وہ بھی آنسو بہاتے نظر آتے تھے۔ مرنے کے بعد اگلے ایک ماہ تک کے لیے ملک میں سوگ منانے کا اعلان کر دیا گیا۔ ڈسکو، بار کے اوقات کم ہوئے۔ انٹرٹینمنٹ کی جگہوں پر وقت کی کمی کی گئی اور سیاحوں کو تنبیہہ کی گئی کہ وہ بھی احترام میں بے جا شور و غل یا جشن و نشاط کی محفلیں نہ سجائیں۔

خالی ہاتھ آئے تھے خالی ہاتھ جاتا ہے

کہا جاتا ہے کہ سکندر اعظم جس نے آدھی سے زیادہ دُنیا فتح کی تھی مرتے دم کفن سے خالی ہاتھ باہر نکالے گئے تھے تا کہ یہ بات سمجھائی جائے کہ انسان خالی ہاتھ آتا ہے اور خالی ہاتھ ہی اس دنیا سے چلا جاتا ہے۔

بھومی پھنگ نے شاہی خاندان میں آنکھ کھولی اور شہزادے سے بادشاہ کا رتبہ پایا اور طویل عمر بادشاہت کی جس میں نہ صرف اخلاقی اور لسانی امیری رہی بلکہ مالی طور پر بھی سر فہرست رہا۔

دور حاضر میں دنیا کے متعدد سعودی عرب یا خلیجی ممالک یا یورپی ممالک اور ایشیائی ممالک کے سبھی موجودہ بادشاہوں میں بھومی پھنگ سب سے امیر بادشاہ رہا 18 اور 20 بلین والے بادشاہوں سے آگے 22 بلین ڈالر والے سلطان آف برونائی سے بھی زیادہ دولت مند تھے۔

ایک رپورٹ کے مطابق موجودہ بادشاہوں میں بھومی پھنگ تھائی لینڈ کے دنیا کے امیر ترین بادشاہ ہیں جن کے اثاثوں کی مالیت 30 بلین ڈالر سے زیادہ ہے اور دنیا کے پہلے 100 امیر لوگوں میں سے 27 ویں نمبر پر امیر شخص کہلاتے ہیں۔

جو اس جہان فانی سے خالی ہاتھ گئے مگر خوش قسمتی سے دولت سے بھی زیادہ وہ احترام، محبت اور چاہت کی دولت سے مالا مال رہے۔ تاریخ ان کو ہمیشہ ایک اچھے بادشاہ کے عنوان سے یاد رکھے گی۔

حضرت امام بخاریؒ کے مرقد پر

ڈاکٹر سلیمان عبداللہ ڈار/گوجرانوالہ

صبح ہوئی تو حضرت امام بخاریؒ کے مرقد پر جانے کی تیاری کی۔ حضرت امام بخاریؒ اس لحاظ سے مسلم اُمہ کے محسن ہیں کہ انہوں نے سرکارِ دو عالم ﷺ کے ارشادات کی بڑی عرق ریزی سے چھان بین کی۔ ایک ایک حدیث کے حصول کے لیے کئی کئی سفر کیے اور صحیح بخاری شریف مرتب کی جو قرآن کریم کے بعد سب سے زیادہ مستند کتاب سمجھی جاتی ہے۔ امام بخاری کمپلیکس بہت وسیع ہے۔ دور دراز سے لوگ یہاں زیارت کے لیے آتے ہیں۔ اس کے صدر دروازے سے چل کر کافی آگے جائیں تو مقبرہ نظر آتا ہے۔ جبکہ مزار کا فیروزی رنگ کا گنبد تو ہمیں دور سے ہی نظر آ رہا تھا۔ امام بخاریؒ نے دو سال کی عمر سے ہی ناظرہ قرآن پڑھنا شروع کیا اور چھ سال کی عمر میں حفظ کر لیا۔ 16 سال کی عمر میں وہ 26 ہزار احادیث زبانی یاد کر چکے تھے۔ خدا نے انہیں ایسا دماغ دیا تھا کہ جو بھی پڑھتے تھے وہ حفظ ہو جاتا تھا۔ انہوں نے 42 سال کی عمر میں صحیح بخاری مرتب کی۔

ان دنوں ان کی رہائش سمرقند سے دور بخارا شہر میں تھی جو اَب بھی ازبکستان کے 12 مشہور شہروں میں سے ایک ہے۔ بخارا کے بادشاہ نے انہیں کہا کہ اس کے بیٹوں کو روزانہ محل میں آ کر پڑھایا کریں جس پر بادشاہ وقت سے اختلاف ہو گیا۔ بادشاہ سے تعلقات اتنے بگڑے کہ 817 عیسوی میں ہجرت کر کے سمرقند میں اس جگہ آئے جہاں اب ڈاکٹر سلیمان کھڑا تھا۔ اسی جگہ فوت ہوئے اور اسی جگہ دفن ہوئے۔ مقامی لوگ روایت کرتے ہیں کہ سالہا سال تک اس مرقد سے خوشبو آتی رہی۔

1957ء میں سوئیکارنو یہاں آئے۔ دراصل وہ سوویت یونین کے دورے پر آئے تو انہوں نے حضرت امام بخاری کی قبر پر جانے کی خواہش کی۔ اُس وقت کی روس کی حکومت نے لیت و لعل سے کام لیا اور انہیں بتایا کہ راستہ بہت دشوار گزار ہے۔ وہاں تک سڑک نہیں جاتی مگر سوئیکارنو مصر رہے اور یہاں تک کہا کہ اگر مجھے وہاں نہ لے جایا گیا تو رشیا اور انڈونیشیا کے تعلقات خراب ہو سکتے ہیں۔ حکومت نے انہیں یہاں لانے کا انتظام کیا۔ لوگ بتاتے ہیں کہ سوئیکارنو یہاں ساری رات قرآن پاک کی تلاوت کرتے رہے اور اتنی بڑی ہستی کی گم نام قبر پے تو جبی اور خستہ حالی پر دھاڑیں مار مار کر روتے رہے۔ ان کے رونے کی آواز دور دور تک جاتی تھی۔ انہی کی کوشش سے پھر یہاں وسیع و عریض کمپلیکس بنا۔

وسطی ایشیا کے لوگ عموماً غریب ہیں اور وہ مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ نہیں جا سکتے اس لیے وہ اس کمپلیکس کو دوسرا مکہ کہتے ہیں۔ امام بخاریؒ یہاں 61 سال کے ہو کر فوت ہوئے۔ 810 عیسوی یا 194 ہجری کو اس جگہ اُن کی رحلت ہوئی۔ وہ جگہ کافی نشیب میں تھی اُوپر قبر کا تعویذ ہے۔ میں نے نیچے جا کر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر دروازہ بند تھا جہاں قدیم طرز کا ایک تالا لگا ہوا تھا۔ 20 ملکوں میں سفر کر کے احادیث اکٹھی کرنے والی عظیم طابعی ہستی یہاں محو خواب تھی۔

دور دراز سے لوگ زیارت کے لیے آ رہے تھے۔ کچھ نو بیاہتا جوڑے بھی تھے جو مزار کے متولی علماء سے دعا کروانے آئے تھے۔ یہ علماء سیاہ چوغے پہنے ہوئے تھے اور کلین شیوڈ تھے۔ وہ قرآن کریم کی چند صورتیں پڑھتے دعا کرتے اور دولہا سے نذرانہ وصول کر رہے تھے۔ اکثر ازبک لڑکیاں جینز اور سکرٹ پہنے مزار کے آس پاس مٹر گشت کر رہی تھیں اور میں سوچ رہا تھا کہ اگر اس قدر عظیم و بلند ہستی کا مزار لاہور یا گوجرانوالہ میں ہوتا تو یہ لباس پہن کر لڑکیوں کو وہاں کوئی نہ آنے دیتا۔ میں نے سامنے دیکھا تو دو سفید داڑھیاں رکھے شلوار قمیص پہنے ہوئے بزرگ قبر کے پاس کھڑے تھے۔ اشتیاق سے جا کر پوچھا تو پتہ چلا کہ لاہور سے زیارت کے لیے حاضر ہوئے ہیں۔

ہمارے گروپ لیڈر ہمیں واپسی کے اشارے کر رہے تھے۔ جبکہ میرا اموی کیمرہ معذرت خواہ ہو چکا تھا۔ اس لیے جاتے جاتے میں نے پولو رائیڈ کیمرے سے مزار کے پاس کھڑے ہو کر تصویر بنوائی۔

الوداع اے سمرقند:

سمرقند میں دوسرا روز شہر دیکھنے میں گزرا۔

ایک چوک میں امیر تیمور کی دوسرے میں الخوارزمی کی اور تیسرے میں بوعلی سینا کے خوبصورت سنگی مجسمے نصب کیے گئے ہیں۔ الخوارزمی پرانے زمانے کے مشہور سائنس دان تھے اور آج کی ماڈرن میڈیکل سائنس بوعلی سینا ہی کی کتابوں سے چلی ہے۔ تاجکستان میں بوعلی سینا کی پیدائش والی جگہ چھ سو سال پرانا میڈیکل کالج اب بھی موجود ہے۔

سمرقند کے کسی چوک بلڈنگ ہوٹل یا شاہراہ پر کوئی میٹل ڈی ٹیکٹر والا یا سپاہی نظر نہ آیا۔ اس سے اپنے لاہور اور گوجرانوالہ کی سڑکیں یاد آئیں جن پر ناکے اور ایلیٹ فورس کے جوان اسلحہ لے کر الرٹ کھڑے رہتے ہیں۔ کاش ہمارے نصیب میں بھی امن ہوتا۔ اگلے روز سمرقند سے 110 کلومیٹر دور چہار باغ گئے۔ پہاڑوں سے گھری یہ خوبصورت وادی ہے جس میں دور تک میلوں لمبی کھائی ہے۔ اس میں سارا سال پانی اکٹھا ہوتا رہتا ہے۔ کیونکہ ازبکستان اور ملحقہ وسطی ایشیائی ریاستوں میں برف باری بہت ہوتی ہے۔ ان پہاڑوں کو دیومالائی کہانیوں میں کوہ قاف کہتے ہیں۔ میلوں لمبی اس قدرتی جھیل پر ڈیم بھی بنایا گیا ہے۔ ازبکستان لینڈ لاکڈ ملک ہے۔ یعنی اس کو کسی بھی طرف سے سمندر نہیں لگتا۔ اس لیے یہاں کے لوگ اس جھیل کے پاس مصنوعی سا ساحل بنا کر انجوائے کرنے آتے ہیں یہاں سکوبا ڈرائیونگ اور موٹر بوٹ کی ریس لگائی۔ گو کہ میں یہ سارے کرتب مختلف ملکوں کے ساحلوں پر اس سے پہلے بھی سرانجام دے چکا تھا مگر اس جھیل کا نشہ ان سمندروں سے سوا تھا۔ واپسی پر ہمارے گائیڈ قریبی کلچرل ریستوران میں لے گئے جہاں ازبک دیہاتی ماحول کے مطابق خوبصورت چوکیوں کے گرد منقش قالینوں پر بٹھا کر انہوں نے اپنی مخصوص فربہ روٹی ہمارے سامنے رکھی۔ روٹی پر بھی کئی اقسام کے نقش و نگار بنے تھے۔ زارا اور دینارا نے ہم سب کے آگے مختلف سلادیں اور ازبک باربی کیو کی کئی معطر اقسام چن دی تھیں۔

ازبکستان کے کسی بھی ریستوران، پبلک مقام، ریلوے اسٹیشن یا ہوٹل میں میں نے کسی کو اخبار کتاب یا رسالہ پڑھتے نہیں دیکھا۔ ہو سکتا ہے اشتراکی انقلاب کے بعد لکھنے لکھانے اور سوچوں پر جو پابندی تھی اس کے اب تک ذہنوں پر آثار ہوں۔ ازبکستان میں ریلوے لائن صرف تاشقند اور ثمرقند کے درمیان ہے۔ واپسی اسی جدید ریل پر ہوئی۔ آس پاس کے نظارے قابل دید ہوتے ہیں۔ ہم جب ہوٹل سے ریلوے اسٹیشن پہنچے تو پریشانی یہ ہوئی کہ سامان سے میرے اور تین دوسرے دوستوں کے بیگ غائب تھے۔ میری پریشانی اس لحاظ سے ذرا کم تھی کہ اب ملکوں ملکوں پھر کر یہ جان گیا ہوں کہ پاکستان سے باہر ہوں تو ہر وقت ٹکٹ اور پاسپورٹ اپنے پاس بلکہ عزیز از جان رکھیں۔

"زارا یہ کیسے ممکن ہے کہ آپ کے ملک میں ہمارا سامان کوئی چور لے جائے" ڈاکٹر عتیق نے حیرانی کے عالم میں کہا۔

زارا نے یقین سے کہا "یہ ناممکن ہے!" اور واقعی ایسا ہوا۔ کچھ دیر بعد پتہ چلا کہ ایک قلی انعام کے لالچ میں سامان اُتار کر ہم سے پہلے ہی ریل میں اندر رکھ آیا تھا۔ تاشقند واپسی پر ہم میٹرو یعنی زیر زمین ریلوے کے سفر کا مزہ لینے گئے۔ یہ سوویت یونین کے زمانے میں بنی تھی۔ زمین کے نیچے تازہ ہوا کا نظام اچھا ہے۔ یہ ریلوے تاشقند شہر کے نیچے نہ جانے کہاں کہاں مٹر گشت کرتی پھرتی ہے۔ عام ریلوے سے ذرا چھوٹی ہوتی ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ جن محلوں کے نیچے سے گزرتی ہے وہ گلیاں دھمک سے لرزتی نہ ہوں گی۔ پھر پتہ چلا کہ سطح زمین سے 300 میٹر نیچے رہتی ہے اس لیے اوپر موجود عمارتوں پر اثرانداز نہیں ہوتی۔ میٹرو اسٹیشن پر خوبصورت ماربل کی گلکاری کی گئی تھی جس وجہ سے بعض ہمراہیوں کا خیال تھا کہ یہ میٹرو ملائیشیا اور انگلینڈ سے زیادہ خوبصورت ہے۔ بعض دوستوں کا خیال تھا کہ بوعلی سینا اور حضرت امام بخاریؒ کی جنم بھومی بخارا شہر بھی دیکھیں مگر سفر زیادہ تھا اور تاشقند میں مجھے ٹمپریچر ہو گیا تھا۔ بخار میں گھر کا سکھ یاد آ رہا تھا۔ بخار اور بخارا اکٹھے نہیں ہو سکتے۔ میں نے دوستوں سے کہا کہ واپس گوجرانوالہ ہی چلیں۔ کیونکہ

جیہڑا سکھ اپنے چوبارے
او نہ بلخ تے نہ بخارے

امیر تیمور حضرت امام بخاری، بوعلی سینا، الخوارزمی کے ساتھ ساتھ ہم اسلام کریموف لینن سٹالن، آندروپوف برزنیف اور گورباچوف کو یاد کرتے واپسی کے سفر کی تیاری میں تھے۔ ٹورسٹ بس میں اپنے دوستوں کی طرف سے میں نے زارا اور دینارا کی خدمتوں کی تعریف کی۔ جواب آں غزل کے طور پر زارا نے سب کو بڑی گرم جوشی کے ساتھ امیگریشن کاؤنٹر تک آ کر الوداع کہا۔ جبکہ میں سوچ رہا تھا کہ واپسی واقعی ہر کسی کے بس کا روگ نہیں!

بارسلونا بارسلونا

احمد سعید/فیصل آباد

تیسری دفعہ جب میں بارسلونا جا رہا تھا تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ میں پہلی دفعہ بارسلونا جا رہا ہوں، بلکہ مجھے محسوس ہو رہا تھا کہ میں پہلی دفعہ بھی نہیں جا رہا۔ پہلی بار" بارسلونا" ڈیڑھ دن کے لیے گیا تھا، دوسری بار پروگرام تو پکا تھا پر جا نہیں سکا، تیسری بار پونے دو دن کے لیے جا رہا تھا۔

پہلی مرتبہ جب وہاں پہنچا تو سیکیورٹی کے آدمی نے لائن سے ہی ہمیں باہر نکال لیا۔ میں نے اپنی طرف سے اچھے خاصے کپڑے پہنے ہوئے تھے، اچانک شکل وصورت بھی اس دن معقول دکھائی دے رہی تھی۔ میں نے اس سے عرض کی کہ بھائی! کیا ہوا؟ کہنے لگا، آپ دوسرے راستے سے جائیں۔ دل میں آیا کہ نہ تو ہم مولیوں والے پراٹھے ساتھ لائے ہیں، اور نہ ہی کھا کے آئے ہیں۔ اس نے پھر ہاتھ کے اشارے سے ہمیں اُس راستے پہ جانے کو کہا۔ ہم جلدی سے شرمندہ شرمندہ اس راستے پہ چل پڑے۔ آگے گئے تو ائیر پورٹ سے ہی باہر نکل گئے نہ کسی نے سامان چیک کیا نہ کیمرے کی نظر سے ہماری نظر اتاری گئی۔ پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہاں جو میاں بیوی اکٹھے آئے ہوئے تھے ان کو وہ سیکیورٹی والے حضرت بغیر چیک کئے باہر بھیج رہے تھے۔ فیملی کی اتنی عزت میں نے اس سے پہلے کسی ملک میں ہوتی نہیں دیکھی۔ باہر کسی سے پوچھا کہ میٹرو کہاں سے ملے گی؟ اس نے کہا، کہاں جانا ہے؟ ہم نے جیسے ہی بتایا تو کہنے لگے کہ میٹرو صرف شہر میں چلتی ہے۔ میں نے کہا، ہمارا ہوٹل شہر میں نہیں آتا؟ کہنے لگے، آپکا ہوٹل تو شہر کے ساتھ ساتھ بھی نہیں آتا۔ خیر ہم نے ٹیکسی لی اور شہر سے دور دراز ایک مقام پر واقع اپنے ہوٹل پہنچے۔ "پی آئی اے" کے ایک دوست نے ہمیں وہ ہوٹل بک کرا کے دیا تھا کہ یہ آپ کو سستا پڑے گا۔ جتنا کرایہ ٹیکسی پر لگا کر ہم وہاں پہنچے شہر کے کسی بھی اچھے سے اچھے ہوٹل میں اچھا خاصہ کمرہ مل جاتا تھا۔ لیکن ان کی مہربانی کے انہوں نے ہوٹل کا کمرہ انتہائی سستے لے کر دیا، وہاں پر پہنچانا تو ان کی ذمہ داری میں نہ تھا۔ اتفاقاً کہہ لیجیے یا اتفاقاً اس علاقے میں تقریباً سارے کے سارے پاکستانی تھے۔ اور جس سے پوچھتے وہ اپنا کاروبار "پی سی او" ہی بتاتا، جس سے نہیں پوچھتے وہ بھی کسی نہ کسی طرح بتا دیتا۔ ہم تو وہاں اس نتیجے پر پہنچے کہ یہاں گورنمنٹ فری میں پی سی او لگا کے دیتی ہے۔

کچھ دن پہلے میں نے بھائی کو فرانس فون کر کے بتادیا تھا کہ ہم نے اسپین کی ٹکٹ خرید لی ہے۔ کہنے لگے فرانس کی کیوں نہیں خریدی؟ میں نے کہا، ویزا اسپین کا تھا تو پی آئی اے کے ایک دوست نے مجھے کہا تھا کہ پہلے اسپین ہی جانا۔ تھوڑی دیر چپ رہے پھر کہنے لگے، چل ٹھیک ہے۔ دل نے کہا شکر ہے بہانہ نشانے پہ لگا۔ پھر کہنے لگے کہ اترتے ہی کوئی پیرس کی فلائیٹ دیکھنا۔ اُس وقت تو ٹھیک ہے کہہ دیا، پر بعد میں میں نے سوچا کہ بارسلونا کی سیر وسیاحت تو بیچ میں ہی رہ جاتی ہے۔ میں نے فوراً بھائی کو فون کر کے کہا، یار! وہ بارسلونا سے اترتے ہی فلائیٹ بہت مہنگی پڑتی ہے۔

کہنے لگے، اترنے سے پہلے ہی لے لینا۔

"جہاز میں کہاں بکنگ ہوتی ہے؟"

"میرا مطلب ہے، پاکستان سے ہی لے لو۔"

"پاکستان سے اگر فلائیٹ لیٹ ہوگئی تو اگلی فلائیٹ پھر نئی ہی سمجھیں، یعنی پیسے گئے۔"

"کرنا کیا چاہتے ہو؟"

دل نے کہا،" پھرنے" گئے۔ نہیں نہیں کرنا کیا ہے میرا مطلب ہے اترتے ہی اگلے دن صبح کی لیں گے۔ تھوڑا ٹھہر کے بولے، رات بارسلونا کاٹو گے؟

میں نے ڈرتے ہوئے کہا، نہیں ہوٹل میں۔

"ہوٹل کا کرایہ بہت لگ جائے گا۔"

"نہیں نہیں پاکستان سے بھی سستے ہوٹل مل رہے ہیں۔"

"بلند آواز آئی، ہیں جی؟"

میں نے کہا، ہاں جی ہاں جی۔ انہوں نے بجھے ہوئے لہجے میں فون بند کیا۔

ادھر میں نے چھلانگیں لگاتے ہوئے فون بند کیا۔

PIA والے دوست کے پاس گیا، اسے کہا کہ ہوٹل سستے سے سستا بک کروا دو۔ اس نے انٹرنیٹ سے مجھے ہوٹل دکھانے شروع کر دیئے۔ کئی مرتبہ ہوٹل اتنا سستا دکھائی دے کہ میں انگلی اس پر رکھنے کی بجائے پورا ہاتھ ہی رکھ دوں کہ آگے نہ گزار دینا اسے۔ وہ میری طرف دیکھے اور کہے، جگہ ٹھیک نہیں۔ میں پھر کسی ہوٹل پر ہاتھ رکھوں، وہ پھر کہے کہ جگہ ٹھیک نہیں۔ میں نے اسے روک کر پوچھ ہی لیا کہ جگہ ٹھیک نہیں سے کیا مراد ہے؟ کہنے لگا یار! تمہیں کیا بتاؤں؟ میں نے کہا،" یاراں توں بے خبر ای رکھیو"۔ کہنے لگا، اس علاقے میں بے حیائی بہت عام ہے۔ میں نے کہا، او بھائی! بے حیائی تو پورے یورپ میں عام ہے، یہ کونسی نئی بات کی تم نے۔ بہر حال اتنے بے حیائی کے علاقے کے علاوہ ایک ہوٹل ہمیں انتہائی سستی قیمت پر بک کرا دیا، اور کہنے لگا کہ کیا یاد کرو گے۔ بس اسپین پہنچ کر جیسے جیسے ہم اُس ہوٹل تک پہنچے اسے یاد ہی کرتے ہیں۔ جب اس ہوٹل پہنچے اور انہیں اپنی ریزرویشن دکھائی تو وہ بڑے حیران ہوئے، مجھے لگا کہ ہمارا کمرہ کسی کو دے دیا ہے۔ لیکن حیران شاید وہ اس لیے ہوئے کہ ریزرویشن تک تو بات ٹھیک تھی پر آپ تو واقعی آ بھی گئے۔ پیرس جانے کے لیے میں نے یہ طریقہ نکالا کہ پیرس ٹرین پر جایا جائے، ویسے یہ طریقہ میں نے پاکستان سے چلتے ہوئے ہی نکال لیا تھا، تا کہ سیر کا پورا مزہ اٹھایا جا سکے۔ ہوٹل میں اپنا سامان رکھ کر ٹرین کی ٹکٹ لینے نکل پڑا۔ شام پھیل رہی تھی، جدھر دیکھوں لوگ سائیکلوں پر سوار، سائیکلوں کے الگ راستے بنے ہوئے تھے۔ ایک دفعہ تو چلتے چلتے میں اس

راستے پہ ہی چل پڑا۔'' بے خطر کود پڑا آتش نمرود اس عشق'' دو لڑکیاں سائیکلوں پر سوار میرے پاس سے گزریں تو مجھے بار بار پیچھے مڑ کر دیکھتی گئیں۔ دل نے کہا کہ آج تک پاکستان میں کسی لڑکی نے سیدھے منہ سے ہمیں نہیں دیکھا یہ منہ موڑ موڑ کر دیکھ رہی ہیں، اور مسلسل دیکھ رہی ہیں۔ بس دل نے وہیں فیصلہ کیا کہ لوگوں کو خالص حُسن کی پہچان یورپ میں ہی ہے۔ اتنی دیر میں تین چار لڑکے بھی میری طرف مڑ مڑ کر دیکھنے لگے اور ایک نے تو رک کر کہہ ہی دیا کہ پلیز یہ راستہ بائیکل کا ہے، خودکشی کے لیے وہ ساتھ ہی بڑا روڈ موجود ہے۔ بس کیا کہتے انہیں فوری طور پہ معافی مانگی، اور پھر ادھر اُدھر دیکھے بنا سیدھا ٹرین اسٹیشن پہنچا، جہاں سے فرانس کی دو ٹکٹیں لیں اور صبح فرانس کو روانہ ہو گئے۔

تیسری دفعہ مشاعرے میں شرکت کیلئے اسپین پہنچا تھا، ابھی پہنچا ہی تھا کہ سانت ٹرین اسٹیشن کے باہر بس اسٹینڈ پر ایک لڑکی کیساتھ ادھر اُدھر کی چھوڑنے لگا، اتنی دیر میں میں نے ارشد نذیر ساحل جنہوں نے مجھے لینے آنا تھا کو اپنی طرف بڑھتے دیکھا۔ ساحل کو آتے دیکھ کر میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے، حالانکہ میں اس لڑکی سے فقط باتیں ہی کر رہا تھا۔ پہلے دل میں آیا کہ فوراً ساحل کی طرف لپکوں، پھر سوچا کہ اس طرح تو وہ اور شکوک وشبہات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ اب میں کبھی لڑکی کو دیکھوں اور کبھی ساحل کو۔ میں نے سوچا، یونہی کھڑے رہنا بھی ٹھیک نہیں۔ بالکل نارمل ہو کر دوشیزہ اسپین سے گفتگو کرتے رہنا چاہیے۔ ساحل میرے بہت قریب آ گئے تو میرا دل کیا کہ انہیں کہوں کہ

ساحل کیوں کھڑے ہو تمہیں کیا غم چلے جاؤ
''میں ڈوب رہا ہوں ابھی ڈوبا تو نہیں ہوں''

میں نے انھیں گلے (ساحل کو) مل کر بتایا کہ یہ لڑکی ہے، میرا مطلب اسپینش لڑکی۔ خیر جو میرے منہ میں الا بلا آتا گیا اپنے آپ کو بچانے کے لیے میں نے بولا۔ اس لڑکی سے ارشد نذیر ساحل کا تعارف بھی کروایا۔ ساحل نیچے نظریں کر کے کھڑے رہے جیسے کہہ رہے ہوں ''جو پھلاں تسی مارن دئے او، او تسی ہی مار رہے او'' میں اس میں ذرا بھر بھی شامل نہیں۔ وہاں سے فارغ ہو کر وہ مجھے گیسٹ ہاؤس کی طرف لے گئے۔ اس واقع کا انھوں نے ایسا اثر لیا کہ گیسٹ ہاؤس کے سامنے سے دو بار گزر کر بھی ان کو گیسٹ ہاؤس نہ ملا۔ راستے میں میں نے پھر کلیئر کرنا شروع کر دیا کہ وہ لڑکی خود بخود ہی میرے پاس پہنچ گئی، میں نے بتایا کہ میں بس سٹاپ پہ کھڑا تھا تو یہ لڑکی دور سے آتی آتی بس سٹاپ پر آ کر سٹاپ ہو گئی۔ آخر کار تیسرے چوتھے چکر پر جب انھیں تھوڑا ہوش آیا ہو گا تو ہمیں گیسٹ ہاؤس ملا۔ گیسٹ ہاؤس میں طارق الیاس سے ملاقات ہوئی، وہ جرمنی سے تشرف لائے تھے۔ ساحل ہم دونوں کو ایک عدد بیڈ پہ چھوڑ کر نکل گئے۔ بستر پر ابھی لیٹے ہی تھے کہ طارق الیاس کے خراٹے پہ خراٹے آنے لگے، خراٹوں کو آغاز ہوئے ابھی چند ہی لمحے گزرے تھے کہ اس اندھیرے میں جہاں ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہ دے رہا تھا، ایک آہنی ہاتھ سید حامیری ناک پہ آ کر بجا۔ درد سے میری چیخ نکلی جو کہ بلند وبالا خراٹوں میں ضم ہو کر رہ گئی۔ ان کا ہاتھ منہ سے ہٹایا اور میں بستر کے بالکل کونے پہ آیا۔ صبح اٹھتے ہی کہنے لگے، آپ پہلے نہا لیں۔ میرا تو کوئی موڈ اور موقعہ نہیں تھا نہانے کا۔

تھوڑی دیر بعد حسن عباسی، رابطہ شفیق کیانی کیساتھ تشریف لائے۔ حسن عباسی نے ہی مجھے یہاں آنے کی دعوت دی تھی۔ شفیق کیانی نے بتایا کہ پانچ گھنٹے رہتے ہیں تقریب کے شروع ہونے میں، سو پانچ گھنٹے ہمارے پاس ہیں شہر نازک (لڑکیوں کے شہر) کو دیکھنے کے لئے۔ دل نے کہا، پانچ گھنٹے میں چڑیا گھر ٹھیک سے نہیں دیکھ ہوتا، خیر ہم سب بیٹھ گئے۔ ابھی راستے پہ چڑھے ہی تھے کہ حسیناؤں کے جھونکے پاس سے گزرے تو دل نے بے دریغ کہا

پہنچ جائیں گے ہم حسینوں کے گھر تک
'' جو اس راہ کی ابتدا ہو گئی ہے''

راستے میں ''رملا'' آیا تو میں کملا ہی ہو گیا۔ میں نے کافی اشاروں، کنایوں سے کوشش کی کہ کسی طرح کچھ دیر کیلئے یہاں قیام پذیر ہوا جائے لیکن شفیق کیانی مجھے جی جی کہتے ہوئے یہ بھی کہتے گئے کہ جگہ ہی نہیں مل رہی گاڑی لگانے کی، کہاں لگائیں کہاں لگائیں کرتے کرتے ''رملا'' سے رفو چکر ہو گئے۔ حسن عباسی بار بار اگلی سیٹ سے مڑ مڑ کے مجھے کبھی غصے اور کبھی حسرت سے دیکھ رہے تھے، جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ وہ گاڑی نہیں روک رہے تو تم ہی گاڑی سے چھلانگ لگا دو، کوئی تو روکے گاڑی۔

شفیق کیانی کی سوچ انتہائی حکیمانہ تھی، کیونکہ ہم نے تو بارسلونا سے چلے جانا تھا اور انھوں نے اسی شہر میں رہنا تھا، دن دھیاڑے اس بے باک علاقے میں وہ کسی صورت بھی گاڑی نہیں روک سکتے تھے۔ باقی کے سفر میں یقیناً حسن عباسی مجھے یہ کہنا چاہتے ہوں گے کہ ''فیصل آبادی ہو کے وی کوئی کم نہ وکھا سکیاں''۔ بس جی ''من در چہ خیالم وفلک در چہ خیال''۔

پانچ گھنٹے گھومتے گھماتے ہم آخر کار قرطبہ میرج حال پہنچے، یہاں کسی شاعر کی شادی نہیں تھی بلکہ قلم قافلہ اسپین اور ریڈیو پاکسلونا کے زیر اہتمام ایک شام حسن عباسی کے نام اور مشاعرہ تھا، اور وہ شام کتنی حسین تھی، جس کو بیان کرنا میرے بس سے باہر ہے۔ مشاعرے کے بعد کھانے کا دور چلا، اور کھانے میں کیا چانپیں چلیں، کوئی ڈیڑھ ڈیڑھ فٹ کی چانپ۔ اتنی بڑی چانپیں پاکستان میں کوئی کھاتے ہوئے دیکھ لے تو پکار اُٹھے کہ بھائی جان! ''اج نے کھوتا ای چل رہیا''۔ میرے ساتھ بیٹھے طارق حفیظ عباسی اور حافظ احمد مسکرا کر مجھے ایسے دیکھ رہے تھے جیسے کہنا چاہتے ہوں کہ ''چانپاں ای کھاؤ جناب، ہڈیاں نہیں''۔

رات کے بارہ بج چکے تھے، صبح چھ بجے واپسی کی فلائیٹ تھی۔ اس شہر کو چھوڑتے ہوئے دل بڑا مضطرب تھا، پھر میں نے دل کو یہ کہہ کر تسلی دی کہ میں اس من موہنی شہر میں ایک بار پھر آؤں گا۔

کھیل ہی تو ہے

عامر بن علی/ جاپان

قومی کرکٹ ٹیم کو پاکستان کرکٹ بورڈ کی انتظامیہ سمیت ایک قطار میں کھڑا کر کے گولی ماردینی چاہئے۔آج کل پاکستان کرکٹ ٹیم پر ہونے والی تنقید اور اصلاح احوال کے لئے پیش کی جانے والی تجاویز کا لب لباب کم وبیش یہی ہے۔مشکل مگر اس طریقہ علاج میں یہ ہے کہ اگر ہر ٹورنامنٹ میں ناکامی پہ یہی سزا برقرار رکھی گئی تو مستقبل میں کھیلوں کو اس سے فائدہ ہونے کا امکان کم اور نقصان کا اندیشہ زیادہ ہے۔اس لئے عوام سے دست بستہ گزارش ہے کہ سزاؤں میں کچھ نرمیاں لے کر آئیں۔پاکستان کرکٹ ٹیم نے اپنے ابتدائی میچوں میں بری کارکردگی دکھائی ہے۔مگر قوم کے اتنی جلدی مایوس ہونے کی بھی کوئی وجہ نظر نہیں آتی۔ورلڈ کپ 2015 میں کئی ممالک کی ٹیمیں ہم سے بھی بری کارکردگی کا مظاہرہ کر رہی ہیں۔اور بعض ٹیموں کی کارکردگی ، جسے ناکارکردگی کہنا زیادہ درست ہے،ہم سے مماثلت رکھتی ہے۔

معین خان پر تنقید اس حوالے سے جائز ہے کہ انہوں نے بطور چیف سلیکٹر اچھی ٹیم کا انتخاب نہیں کیا۔مثال کے طور پر یونس خان کی ٹیم میں جگہ نہیں بنتی تھی،سرفراز احمد اور یاسر شاہ سمیت کئی نوجوان کھلاڑی بہتر فارم میں تھے،انہیں کھیلنے کا موقع دینا چاہئے تھا۔کچھ کھلاڑی ورلڈ کپ کی تیاری کے مرحلے میں ٹیم سے باہر رکھے گئے اور جب ٹورنامنٹ کھیلنے کا موقع آیا تو ان کو ٹیم میں شامل کر لیا گیا۔یہ عقل سے بالاتر اور غیر منطقی طریقہ انتخاب ہے۔جس پر معین خان کی سرزنش ہونی چاہیے تھی۔ہمارے ہاں مگر تنقید کا زاویہ بالکل ہی مختلف اور کسینو چلے جانے کے حوالے سے ہے۔اچھی خاصی تعداد میں چھپنے اور پڑھے جانے والی اردو اخبارات چیختی ،چنگھاڑتی پانچ پانچ، چھ چھ کالمی شہ سرخیاں لگا رہی ہیں کہ معین خان کیسینو چلے گئے!! چیف سلیکٹر کی حیثیت سے ان کی ناکارکردگی کی بجائے کسینو تشریف لے جانے کی بنیاد پر انہیں کرکٹ بورڈ نے حکماً ٹورنامنٹ کے دوران واپس بلا لیا ہے۔معین خان کے استعفیٰ اور وطن واپسی کی خبریں ایک ساتھ گردش میں ہیں۔پاکستان میں کیونکہ کسینو نہیں ہوتے ہیں،اس لئے عوام الناس کے ذہن میں قمار خانے سے مراد گناہ گاروں کی جائے پناہ اور شیطانی کارخانے کا خیال ابھرتا ہے،جان کی امان چاہتے ہوئے عرض کرتا ہوں کہ مغربی دنیا میں کسینو کا مفہوم اس سے بہت مختلف ہے،جو ہمارے عمومی اردو اخبارات کے ذہن میں پایا جاتا ہے۔یورپ، شمالی وجنوبی امریکہ اور عالم کفر کے دیگر مراکز میں جو کسینو میں نے دیکھے ہیں،وہاں جوا کھیلنے والوں سے کہیں زیادہ تعداد ان لوگوں کی ہوتی ہے جو فقط تفریح طبع کے لئے آئے ہوتے ہیں۔چائے کافی اور مشروبات مغرب سے دل بہلاتے ہیں،کھاتے پیتے اور رنگ برنگی روشنیاں دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔موسیقی سے محظوظ ہوتے ،رقص کرتے فواروں کو دیکھتے ،زندگی حرکت میں محسوس ہوتی ہے۔خوشی اور غم کے پل پل بدلتے رنگ، جواریوں کی مناجات،ہار اور جیت کے تاثرات کا تنوع،یہ سب کچھ بھی قابل دید ہوتا ہے۔

بات یہ ہے کہ رات گئے دیار مغرب میں بھی مے خانوں اور قمار خانوں کے علاوہ بیٹھنے اور گپ شپ کرنے کے لئے کم ہی مقامات دستیاب ہوتے ہیں۔ان وضاحتوں کی ایک وجہ ذاتی نوعیت کی بھی ہے۔وہ یہ کہ چند سال لاطینی امریکہ میں بحر الکاہل کے ساحل پر واقع جس گھر میں میرا قیام رہا،اس کے بالمقابل کسینو تھا۔سمندر کنارے میرے مکان اور کسینو کے درمیان صرف دو رویہ سڑک حائل تھی۔اکثر یوں ہوتا کہ جب کسی دوست سے گپ شپ کا موڈ ہوتا تو اسے گھر مدعو کرنے کی بجائے کسینو کے کیفے ٹیریا میں بلوا لیتا۔وہاں بیٹھ کر کافی پیتے،شعر وادب سے لے کر سیاست وتجارت سمیت دنیا بھر کے موضوعات با آواز بلند زیر بحث رہتے تھے۔کسینو میں ہمارے علاوہ اور بھی بہت سے لوگ گپ شپ اور مٹرگشت کے لئے آئے ہوتے تھے۔بخدا! میں اس تمام دورانیے میں کبھی ایک بار بھی جوا نہیں کھیلا،ایک پیسے کا بھی نہیں۔سچی بات تو یہ ہے کہ مجھے جوکھیلنا بھی نہیں آتا۔کبھی سیکھنے کی کوشش بھی نہیں کی،یہ کم علمی اور عدم دلچسپی بلا وجہ بھی نہیں ہے۔اس کے پیچھے بھی ایک دردناک داستان ہے۔خلاصہ جس کا یوں ہے کہ چوتھی جماعت میں تختی پر املا اور خوش خطی کے لئے استعمال ہونے والے قلم کا ہم لوگ سٹہ کھیلتے تھے،ایک دن میں نے ایم سی

پرائمری سکول میاں چنوں میں اپنے ہم جماعت سے اس کے پاس دستیاب سرکنڈے کی قلموں سے زیادہ تعداد میں، اسے ادھار دے کر جیت لیں۔ طے یہ پایا کہ وہ قلموں کی بجائے مجھے ایک روپیہ سکہ رائج الوقت ادا کرے گا۔ کئی دن گزر گئے مگر میرے ہم جماعت نے مجھے وہ ایک روپیہ ادا نہ کیا، ممکن ہے اس کے پاس ہوگا ہی نہیں۔ قصہ مختصر، میں نے شوخی میں آکر ماسٹر جی سے شکایت کر دی کہ وہ میرا ایک روپیہ نہیں دے رہا۔ ماسٹر جی نے استفسار کیا کہ وہ کس چیز کا؟ جواب میں سادگی کے ساتھ میں نے تمام واقعہ بیان کر دیا۔

ماسٹر جی نے ایک روپیہ مجھے دلوانے کی بجائے حکم دیا کہ میں مرغا بن جاؤں۔ مرغا بننا زیادہ توہین آمیز اس لئے بھی لگا کہ میں کلاس مانیٹر تھا۔ ویسے بھی کبھی کوئی ایسی کوتاہی سرزد نہ ہوئی تھی جس کی بناء پر مجھے سزا ملی ہو، یہ واحد واقعہ یاد پڑتا ہے، شائد آدھا گھنٹہ مرغا بنائے رکھنے کے بعد جب خلاصی ہوئی تو ماسٹر جی نے کہا، بیٹا! اب تم زندگی میں کبھی جوا نہیں کھیلو گے۔ خدا گواہ ہے کہ ماسٹر یونس کی یہ پیش گوئی حرف بہ حرف سچ ثابت ہوئی۔ اللہ تعالیٰ انہیں غریق رحمت کرے، بڑے نیک طینت آدمی تھے۔

عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ معین خان کو مصلوب کرنے سے پہلے ذرا یہ تسلی کر لیں کہ وہ کسینو صرف رونق میلہ دیکھنے گیا تھا یا پھر وہاں جوا کھیلتا رہا ہے۔ کیونکہ صرف کسینو چلے جانا کوئی ایسا جرم نہیں کہ اس پر چھ کالمی سرخی جمائی جائے۔ میں مانتا ہوں کہ ہمیں اپنا غم و غصہ منانے کے لئے قربانی کے ایک بکرے کی شدید ضرورت ہے، ایک لمحے کے لئے مگر یہ سوچئے کہ اگر واقعی معین خان سچ بول رہا ہے؟ ہوسکتا ہے وہ کسینو کھانا کھانے ہی گیا ہو؟ جہاں تک کرکٹ ٹیم کے کھلاڑیوں پر ورلڈ کپ میں خراب کارکردگی کے حوالے سے تنقید کا تعلق ہے، تنقید کرنا ہمارا حق اور یہ بجا بھی ہے، مگر میڈیا اور عوام اسی انداز میں تنقید کریں۔ جیسے ہم اپنے بچوں کو خراب کھیلنے پر تنقید کا نشانہ بناتے ہیں، قومی کرکٹ ٹیم کے کھلاڑی بھی تو اسی قوم کے بچے ہیں۔ میچ ہارنے کی صورت میں تمام ٹیم کو سزائے موت سنانے سے ہمیں گریز کرنا چاہئے۔ جیت کا اپنا مزہ ہے لیکن ہار کو تسلیم کرنے کے لیے حوصلہ اور وقار بھی معمولی بات نہیں ہے۔ آخری یہ گزارش ہے کہ کرکٹ فقط ایک کھیل ہے، اسے کھیل ہی سمجھنا چاہئے، یہ کوئی جنگ نہیں ہے۔ زندگی اور موت کا مسئلہ تو قطعاً نہیں ہے۔

سکول، کالج، یونیورسٹی کے طلباء اور ریسرچ سکالرز کے لیے ہماری چند کتب

مضامین پطرس	پطرس	140/- روپے
مضامین فرحت اللہ بیگ	مرتب: ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی	350/- روپے
جاڑے کی چاندنی	غلام عباس	200/- روپے
مراۃ العروس مع فرہنگ	ڈپٹی نذیر احمد	200/- روپے
اُردو تحقیق صورت حال اور تقاضے	ڈاکٹر معین الدین عقیل	700/- روپے
اُردو ادب کا ارتقاء	ڈاکٹر وحید قریشی	150/- روپے
اُردو تنقید (انتخاب مضامین)	پروفیسر اشتیاق احمد	700/- روپے
اُردو غزل (غزل کی دو سو سالہ تاریخ)	ڈاکٹر یوسف حسین خان	800/- روپے
مقدمہ شعر و شاعری	الطاف حسین حالی	200/- روپے
مقالات اقبال	عبدالواحد معینی	400/- روپے
تنقیدات حسین فراقی	پروفیسر اشتیاق احمد	700 روپے
تنقید اور مجلسی تنقید	ڈاکٹر وزیر آغا	300/- روپے
تحقیق شناسی	ڈاکٹر رفاقت علی شاہد	500/- روپے
اصلاح تلفظ و املاء	طالب ہاشمی	250/- روپے
اُردو کے 25 افسانے	ڈاکٹر اورنگ زیب عالمگیر	500/- روپے
نیا افسانہ اور قاری	ڈاکٹر طاہر تونسوی	250/- روپے
ولی تحقیق و تنقیدی مطالعہ	ڈاکٹر محمد اشرف خان	250/- روپے
فیض احمد فیض (تنقیدی مطالعہ)	ڈاکٹر طاہر تونسوی	400/- روپے
داستان اقبال	آمنہ صدیقہ	200/- روپے

ناشر: القمر انٹر پرائزز، غزنی سٹریٹ اُردو بازار، لاہور 042-37237500

تتلیاں ستاتی ہیں

حسن عباسی/لاہور

یورپ میں سیر کے لئے ہمیشہ گرمیوں کی چھٹیوں میں آنا چاہیے۔ ہر طرف کیا رونقیں ہوتی ہیں۔ چار سو میلے کا سماں ہوتا ہے۔ اس وقت شعیب صاحب اور میں جس صدر دروازے سے داخل ہو رہے ہیں اس کے ماتھے پر (TIVOLI) لکھا ہے اور اس کے اندر میلے کا سماں ہی نہیں بلکہ میلہ لگا ہوا ہے اور اس میلے میں ڈنمارک سے ہی نہیں بلکہ دیگر ملکوں سے بھی لوگ آئے ہوئے ہیں کیونکہ فیملیز کے لئے تو یہ بہت بڑا اور یادگار تفریحی پارک ہے جو کہ ٹاؤن ہال کے بالکل سامنے ہے۔ ڈیڑھ سو سال قبل اسے ڈنمارک کے بادشاہ جارج نے بنوایا تھا تاکہ عوام کو تفریح مہیا ہو سکے اور وہ خوش رہیں۔ ٹی وے لی ڈنمارک کا سماجی و ثقافتی میلہ ہے اس جیسی شہرت اور مقبولیت اور کسی کو حاصل نہیں۔ اندر داخل ہوتے ہی ایک خوبصورت جھیل جس کے ہر طرف سبزہ بچھا ہوتا ہے آپ کے ساتھ ساتھ چلتی ہے جس میں پرانے زمانے کے بادبانی جہاز لنگر انداز ہیں۔ ان جہازوں میں ریستوران جو کہ جدید فرنیچرز سے آراستہ ہیں وہاں بیٹھ کر کسی دلنشیں گوری کے ہاتھ کا مشروب پینے کے لئے مہینوں پہلے بکنگ کرانا پڑتی ہے۔ یہاں رقص، موسیقی، تھیٹرز اور ہر قسم کے کھانے وافر ہیں۔ 1843ء سے "TIVOLI" سیاحوں اور مقامی لوگوں کے لئے دلچسپی کا مرکز ہے۔ رنگا رنگ پھولوں سے آراستہ راستے، فوارے، تھیٹرز، دکانیں، جادوگر، جادوگر حسینائیں زندگی ہر طرف جواں اور رواں دواں کچھ دیر کے لئے غم بھلانے کے لئے یہ بہترین جگہ ہے مگر یہاں جتنے چہرے آئے ہوئے ہیں ان کو دیکھ کر بالکل اندازہ نہیں ہوتا کہ ان کو کوئی غم بھی ہے۔

رات کے وقت آتش بازی کا شاندار مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ TIVOLI میں رات کو ایک لاکھ دس ہزار سے بھی زائد برقی قمقمے اپنی چمک دکھاتے ہیں۔ اس پارک میں چائنیز عمارتوں کی بہتات ہے۔ باوردی خوبصورت لڑکیاں اور لڑکے ساز بجا رہے ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ میوزک کنسرٹ کا اہتمام ہوتا ہے۔ اس میلے میں بچوں کی کثیر تعداد نے مجھے بھی بچہ بنا دیا۔ رونقیں دیکھ کر اپنے شہر کا میلہ یاد آ گیا جو کہ حضرت خواجہ خدا بخشؒ کے عرس پر لگا کرتا۔ سرکس، موت کے کنویں، میجک شوز، چڑیا گھر، عجائب گھر، کھلونوں کی دکانیں، پکچی تا کی فلمیں اور بہت سے جھولے۔ ہنڈولا جھولا جسے میلے میں سب سے پہلے "پہلوان" لے کر آتا تھا اور میلہ ختم ہو جانے کے بعد بھی وہ کافی دن تک وہاں رہتا تھا۔ پہلوان چلتے ہوئے جھولے کے اندر اس کے سپورٹنگ راڈ پکڑ کر بندر کی سی پھرتی کے ساتھ چھلانگیں لگاتا رہتا اور پھر اچانک کسی کیبن کے ساتھ لٹک کر زمین پر آ جاتا ہے۔ جھولے کا کیبن جب اوپر جاتا تو شہر کا نظارہ قابل دید ہوتا مگر جب نیچے آتا تو دل ڈوب سا جاتا جیسے کسی گہرے کنویں میں پتھر پھینکا گیا ہو۔ پہلوان چلتے جھولے کے دوران جس کیبن سے لٹک جاتا وہ کیبن پہلے بھی زور سے ہل رہا ہوتا تھا پھر تو بالکل ہی ٹیڑھا ہو جاتا اور بچوں کی چیخیں نکل جاتیں۔ مجھے آج بھی یوں لگتا ہے جیسے میں اسی جھولے میں اسی خوف کے ساتھ بیٹھا ہوں کہ اچانک کہیں سے پہلوان آ کر کیبن سے لٹک جائے گا اور میں نیچے گر جاؤں گا۔ زندگی کے میلے میں یہی خوف ہر وقت میرے ساتھ ساتھ چلتا رہا۔

میرے شہر خیر پور ٹامے والی کے میلے اور کوپن ہیگن کے میلے میں ظاہر ہے زمین آسمان کا فرق تھا، وہاں ہر چیز سادہ اور ہینڈ میڈ تھی یہاں سب جھولے جدید اور باکمال تھے۔ وہاں ہر چیز ابتدائی مراحل والی تھی۔ یہاں ہر چیز کا جادو سر چڑھ کر بولتا تھا اور انتہاؤں کو چھو رہی تھی۔ وہاں کے لوگ، عورتیں، بچے، مرد سادہ تھے۔ میلہ سال بھر میں ان کی واحد تفریح تھی وہ ارد گرد کے قریبی دیہات سے جوق در جوق اسے دیکھنے کے لئے آتے اور عید کا سماں ہوتا۔ ان کی آنکھوں میں میلہ دیکھنے کی عجیب سی چمک ہوتی جو یہاں کی آنکھوں میں مفقود تھی۔ یہاں چونکہ سینکڑوں تفریحی مقامات ہیں نیز بچوں اور بڑوں کے لئے دلچسپی کی اور بھی بہت سی چیزیں ہیں اس لئے یہاں آنکھوں میں ایک بے نیازی تھی جو اشیاء کی بہتات کے بعد خود بخود در آتی ہے لہٰذا ان کی نسبت میلہ شعیب صاحب اور میں نے لوٹا کیونکہ ہم قریبی دیہات سے آئے ہوئے تھے۔

مشاعرہ تو حقیقت میں اُس نے لوٹا ہے
وہ ایک لڑکی جو دروازے میں کھڑی ہوئی ہے

پرانے ماڈل کی گاڑیاں ٹوالی میں مختلف جگہوں

پر ہمیں ہنستی مسکراتی ہوئی ملیں۔ ہم نے بھی ان کے ساتھ ہنستے مسکراتے تصویریں بنائیں۔ میرے پاس Disposible کیمروں کا شاپر بھرا ہوا تھا۔

میں تو اس کا سبز گنبد اور مینار دیکھ کر اسے کوئی دربار سمجھا اور ثوابی میں ایک بزرگ کا مزار میرے لئے وجہ حیرت نہیں باعث کشش بھی تھا۔ سو قدم خود بخود اس جانب اٹھتے گئے اور قریب جا کر ہاتھ بھی دعا کے لئے اٹھ گئے مگر یہ تو کسی گولا بیچنے والے کی دکان تھی۔ سو گولا کھاتے ہی بنی یہ گورے بھی ناں۔ ان کو کیا کیا سوجھتا رہتا ہے۔ پردیسیوں کے جذبات سے کھیلنے کا ہنر خوب آتا ہے اور تو کچھ نہیں کم از کم اپنی عورتوں کو کپڑے ہی پورے خرید کے دے دیا کریں۔

اس تفریحی پارک کا آغاز 15 اگست 1843ء کو ہوا۔ اس طرح اس کا شمار دنیا کے قدیم ترین تفریحی پارک میں ہوتا ہے۔ میں نے اس پارک میں موجود ہر چیز کو آنکھیں مل کر اور ہاتھ لگا کر دیکھا مگر کوئی بھی چیز قدیم نہیں لگتی تھی۔ سب چیزیں نئی نئی اور اجلی اجلی دکھائی دیتی تھیں اور ان کو دیکھ کر آنکھوں کی چمک میں اضافہ ہوتا تھا۔ جھیل کے کنارے پھیلے سبزے جیسی شادابی چہروں پر بھی پھیلی ہوئی تھی۔ ابتداء میں ٹی وے لی کے بانی GEORGE CARSTENSEN کو سرکار کی طرف سے 15 ایکڑ زمین سالانہ کرایہ پر فراہم کی گئی۔ 1850ء تک یہ کوپن ہیگن شہر سے باہر تھا۔ اس کے قیام کا مقصد لوگوں کو تفریح فراہم کرنا نہیں بلکہ سیاست سے دور رکھنا تھا۔ بادشاہ CRISTIAN VIII نے خود کہا: ''جب لوگوں کو تفریح کے مواقع ملیں گے تو وہ سیاست سے متعلق نہیں سوچیں گے''۔ یہ وہ قدیم سوچ تھی جو روم کی بادشاہت سے منتقل ہوئی تھی، وہاں بھی اسی مقصد کے حصول کے لئے سارا سال کھیلوں کے مقابلے منعقد کئے جاتے تھے تاکہ لوگوں کی توجہ اصل مسائل سے ہٹا کر کھیلوں کی طرف ہو جائے اور حکمران اقتدار کے مزے لوٹیں اور یہ سوچ آج بھی موجود ہے۔

خود ہمارے ہاں جب ملک غربت، دہشت گردی، معاشی انحطاط، لوڈ شیڈنگ اور دیگر بے شمار مسائل کا شکار ہے اس کے سب سے بڑے صوبے میں اتنے وسیع پیمانے پر کھیلوں کا انعقاد اور اربوں روپے کے زیاں سے کیا ثابت ہوتا ہے کہ ہمارے حکمران کیا چاہتے ہیں۔ بادشاہت کی سوچ رکھنے والے عوام کو پرانی شراب نئے پیمانوں میں پلاتے آئے ہیں۔

ٹی وے لی ابتداء سے ہی تفریح کی بہت سی چیزوں پر مشتمل تھا اور پھر وقت کے ساتھ ان کی تعداد، خوبصورتی اور دلکشی میں اضافہ ہوتا رہا۔ اس کے اندر جو قابل ذکر عمارتیں ہیں ان کے طرز تعمیر کو مختلف ملکوں کے طرز تعمیر سے مستعار لیا گیا ہے۔ کہیں جاپانی طرز تعمیر کی عمارت سرخ جوڑے میں ملبوس دلہن کی طرح شرما رہی ہوتی ہے تو کہیں مشرقی انداز کی بلڈنگ اپنے ظاہری حسن سے جگمگا رہی ہوتی ہے تو کہیں روسی عمارت بانہیں کھولے سیاحوں کو اپنی طرف بلا رہی ہوتی ہے تو کہیں چائنیز عمارت تفریحی پارک کی دلکشی بڑھا رہی ہوتی ہے۔ نمب محل اور گلاس ہال اپنے اندر ساحرانہ کشش لئے ہوئے ہیں۔ یورپ میں تھیٹر ہمیشہ سے مشہور رہا ہے ماضی میں تفریح اور تربیت کا سب سے بڑا ذریعہ ہی تھیٹر ہوا کرتا تھا لہٰذا یہاں بھی مختلف تھیٹرز کے ہال ہیں جہاں ڈرامے پلے کئے جاتے ہیں جیسا کہ چائنیز اسٹائل کی بلڈنگ گلاس ہال تھیٹر کے نام سے ہے اور اس میں 1900ء سے مسلسل تھیٹر پلے ہو رہا ہے۔ اسی طرح اور بھی تھیٹر، کنسرٹ ہال وغیرہ موجود ہیں۔ ٹی وے لی ہمیشہ سے مقامی اور بین الاقوامی سیاحوں کے لئے پرکشش رہا ہے۔ جس کی وجہ اس کے شاندار ریسٹورنٹس، قابل دید مقامات، کیفے اور کافی شاپس، 21 ایکڑ پر پھیلے خوبصورت قدرتی مناظر، فوارے اور پھولوں کی کیاریاں، جدید مشینی تفریحی جھولے، افقی جھولے، تھیٹر بینڈ اسٹینڈز اور طویل خوبصورت جھیل ہے۔

چار لاکھ سے زائد پھول اس پارک کو جنت ارضی بنا دیتے ہیں جن میں 65000 صرف گل لالہ کے پھول ہوتے ہیں۔ ڈارک کلر لیمپس سر شام درختوں اور راستوں پر اپنی روشنیاں بکھیرنا شروع کر دیتے ہیں۔ رات کو زبردست آتش بازی کا مظاہرہ ہوتا کیا کیا پھل جھڑیاں چھوڑی جاتی ہیں جھیل کے اندر ان کے عکس منظر کو دلفریب و دلکش بنا دیتے ہیں۔ جھیل کے وسط میں ایس ٹی جارج تھرڈ کا بحری جنگی جہاز بھی سیاحوں کے لئے توجہ کا مرکز بنا ہوتا ہے۔

ایڈورڈ اریکسن (Edvard Ericson) نے 23 اگست 1913ء میں ننھی جل پری کا کانسی کا مجسمہ تخلیق کیا جو کہ 1.25 میٹر بلند ہے اور اس کا وزن 175 کلوگرام ہے۔ بدقسمتی سے اس مجسمے کو کئی بار نقصان پہنچایا گیا اور یہ ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا رہا۔ محبت کرنے والوں اور محبت کے دشمن ہر خطے اور ہر دیس میں پائے جاتے ہیں۔ محبت کی علامت کو نقصان پہنچانا بھی محبت کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ چاہے اس کے پس پردہ مقاصد کچھ بھی ہوں لہٰذا اس

معصوم ننھی جل پری پر جنونی بار بار حملہ آور ہوتے رہے، اس کی تاریخ بڑی سفاکانہ اور بھیانک ہے۔ 24 اپریل 1964ء کو اس ننھی جل پری کا سر کاٹ کر کوئی لے گیا اور حکومت کی مکمل کوششوں کے باوجود وہ نہیں مل سکا اس کی سیاسی وجوہات بتائی جاتی ہیں۔ 1984ء میں دایاں ہاتھ کاٹ کر چرا لیا گیا جو کہ دو دن بعد واپس مل گیا۔ 1990ء میں ننھی جل پری کا سر کاٹنے کی ناکام کوشش کی گئی اس کی گردن 18 سینٹی میٹر تک کٹ گئی۔ 6 جنوری 1998ء کو ننھی جل پری کو ایک بار پھر قتل کیا گیا۔ یہ مجرم بھی کبھی نہیں پکڑا گیا البتہ سر ٹی وی سٹیشن کی عمارت کے باہر پڑا ہوا مل گیا جسے 4 فروری 1998ء کو دوبارہ جوڑ دیا گیا۔

10 ستمبر 2003ء کی درمیانی رات ایک دھماکے کے ذریعے ننھی جل پری کو ہمیشہ کے لیے ختم کرنے کی کوشش کی گئی مگر وہ اس میں کامیاب نہیں ہوئے اور وہ بعد میں سمندر میں پڑی ہوئی مل گئی۔ مجھے تو یوں لگتا ہے کہ ننھی جل پری کو اس کی بہنوں نے اپنی طرف کھینچ لیا ہوگا اس لئے وہ بچ گئی اور اس کی کلائی اور گھٹنے پر چوٹ لگی ورنہ وہ مکمل طور پر تباہ ہو جاتی۔

2004ء میں معصوم جل پری کو برقعہ پہنا دیا گیا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ ترکی کی یورپی یونین میں شمولیت کے امکان کے خلاف احتجاج تھا جو کہ پورے یورپ میں مختلف انداز میں دیکھنے میں آیا۔ علاوہ ازیں مئی 2007ء میں بھی ایک بار پھر اسے مسلم لباس اور اسکارف پہنا دیا گیا۔ مذہبی اور دیگر جنونی صرف ہمارے ہاں نہیں بلکہ ہر جگہ پائے جاتے ہیں، خود کو پوری دنیا سے بڑھ کر مہذب کہنے والے معاشروں میں بھی موجود ہیں۔ دکھ تو اس بات کا ہے کہ دنیا والوں نے ہم کو عبث بدنام کیا۔

وقتاً فوقتاً اس ننھی پری پر شرارتاً پینٹ ہوتا رہا اس کے اوپر رنگ گرایا جاتا رہا دو بار 8 مارچ 2007ء اور 8 مارچ 2008ء کو اس کے اوپر سبز رنگ گرا دیا گیا چونکہ 8 مارچ کو خواتین کا عالمی دن ہوتا ہے، اس لئے یہ احتجاج کی کوئی صورت ہو سکتی ہے۔ قصہ مختصر ننھی جل پری نے اپنی دادی اور بہنوں کے سمجھانے اور روکنے کے باوجود ایک انسان سے محبت کی اور انسانوں سے محبت کرنے کی بار بار سزا پائی۔ اچھے اور برے لوگ ہر جگہ موجود ہوتے ہیں۔ درد دل رکھنے والے ننھی جل پری کے زخم بھرتے رہے۔ خوش آئند بات یہ ہے کہ اسے جب بھی نقصان پہنچایا گیا محبت کرنے والوں نے پہلے سے زیادہ شان، خوبصورتی اور تمکنت کے ساتھ اسے وہاں ایستادہ کر دیا کیونکہ یہ محبت کی علامت ہے۔ دنیا سے محبت اور اس کی کسی علامت کو رہتی دنیا تک نہیں مٹایا جا سکتا۔

نوشین اقبال نوشی / کھاریاں

مکمل یہ مجھے ہونے نہیں دیتی
کہ بے چینی مجھے سونے ہیں دیتی

اُداسی میرے اندر بس چکی ہے یوں
مجھے خود پر بھی یہ رونے نہیں دیتی

مری تنہائی بس ہم زاد ہے میری
کبھی تنہا مجھے ہونے نہیں دیتی

یہ نفرت ہی رکاوٹ یار بنتی ہے
جو دل میں چاہتیں بونے نہیں دیتی

ہوئی ہے زندگی دشوار اب ایسے
کہ بوجھ اپنا مجھے ڈھونے نہیں دیتی

مولانا حامد علی خاں کی یاد میں شاہد علی خاں کی زیرِ ادارت شائع ہونے والا مجلّہ

الحمراء

ادبی صحافت میں مقبولیت کے سنگ میل عبور کرتا ہوا گزشتہ پندرہ برس سے ہر ماہ باقاعدگی سے شائع ہو رہا ہے
اپنے ادبی ذوق کی تسکین کے لیے بک سٹال سے طلب فرمائیں یا ہم سے براہِ راست منگوائیں

رابطہ کے لیے دفتر ماہنامہ الحمرا: j-24 ماڈل ٹاؤن، لاہور 0333-4001844

کسی پنجابی ادیب کو اردو زبان پر تشدد کرتے نہیں دیکھا۔ اُردو زبان کی جتنی نشو و نما پنجاب میں ہوئی ہے کہیں نہیں ہوئی

پنجابی شاعری تو کسی حد تک قابل ذکر ہے لیکن نثر پر تو ایک قسم کا جمود طاری ہے

کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں پہنچ کر یوں لگتا ہے جیسے دوسرے پنجاب بلکہ اصلی پنجاب میں آ گیا ہوں

دنیا میں واحد پنجاب ہی ایسا بدنصیب صوبہ ہے جس کے پرائمری سکول میں طالب علموں کو اپنی مادری زبان نہیں پڑھائی جاتی

میرے نزدیک پنجابی ادیب کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پنجابی ادب پڑھے بھی

انٹرویو: پروفیسر عاشق رحیل / گفتگو: حسن عباسی

اردو ٹگ: ابتدا میں پنجابی میں لکھنا شروع کیا یا اُردو میں؟

عاشق رحیل: لکھنے کی ابتدا میں نے اردو سے کی۔ میری طبیعت انشائیے کی طرف مائل تھی۔ انشائیے میں جو ہلکا پھلکا طنز و مزاح پیش کیا جاتا تھا وہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی کنہیالال کپور کی مزاحیہ تحریریں پڑھیں۔ سروس میں آیا تو مشکور حسین یاد صاحب سے میل جول تھا ان کے انشائیے پڑھے۔ ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کو پڑھا بلکہ ان کی زبان سے بھی سنا۔ ڈاکٹر وزیر آغا اور احمد ندیم قاسمی صاحب کے درمیان جس میں مرحوم انور سدید صاحب بھی شامل ہوتے تھے، ہونے والی ادبی نوک جھونک سے بھی حظ اُٹھاتا تھا۔ اردو میں میں نے سب سے پہلے انشائیہ ''جب تیرے شہر سے گزرتا ہوں'' کے عنوان سے لکھا تھا جو کراچی کے ایک اخبار کے ادبی صفحے میں شائع ہوا تھا۔ روزنامہ ''آفاق'' لاہور ہفت روزہ ''اقدام'' اور امروز کے ادبی صفحے میں بھی کچھ انشائیے چھپے۔ اُردو میں ہی کچھ افسانے بھی لکھے تھے جن کا بعد میں پنجابی میں ترجمہ کر لیا گیا۔ اسی طرح انشائیہ کا بھی یہی حشر ہوا لیکن دو تین سال پہلے میں نے اپنے اردو انشائیوں کا ایک مجموعہ ''آہٹیں'' کے نام سے چھاپا ہے۔ اس کے علاوہ پچھلے سال میرا حج کا سفرنامہ ''تیرے روبرو'' بھی اردو میں ہے۔ گورنمنٹ کالج لاہور کے رسالہ ''راوی'' میں میرا ایک بہت لمبا سفرنامہ ''کاغان کی سیر'' بھی چھپا تھا۔ جسے بہت پسند کیا گیا لیکن اس کو پڑھ کر مجھے اے حمید کا مقلد کہا گیا جس کی مجھے بہت خوشی ہوئی۔ کیونکہ اے حمید مرحوم کی تحریروں کو بہت پسند کیا جاتا تھا۔ کچھ سال اردو میں طبع آزمائی کی پھر پنجابی زبان کے بہت مخلص لکھاری جناب آصف خان صاحب کے کہنے پر میں پنجابی ماں بولی کی طرف آ گیا اور اب اس کی بھی خدمت کر رہا ہوں اور ساتھ ساتھ اُردو پڑھ بھی رہا ہوں اور ضرورت پڑنے پر لکھ بھی لیتا ہوں۔ کیونکہ آخر گنہگار ہوں کافر نہیں ہوں میں

اردو ٹگ: طالب علمی کی زندگی کا کوئی یادگار واقعہ؟

عاشق رحیل: ایف اے پاس کرنے کے بعد بی اے میں داخل ہونے کے لیے درخواست دی۔ حالانکہ ایف اے گورنمنٹ کالج سے ہی پاس کیا تھا لیکن تھرڈ ایئر میں داخلے کے لیے پھر انٹرویو دینا پڑتا تھا۔ انٹرویو دینے کی میری باری آئی تو میں کمرے میں گیا۔ اندر چار پانچ پروفیسر صاحبان ڈاکٹر عبدالسلام صاحب (جنہیں بعد میں نوبل پرائز ملا تھا) کی سرکردگی میں انٹرویو لے رہے تھے۔ میں بی اے میں ریاضی اے بی کورس کے مضمون لے رہا تھا جس میں حساب ہی حساب پڑھا جاتا ہے۔ میرا داخلہ فارم دیکھ کر عبدالسلام صاحب نے پوچھا ''ریاضی میں کتنے نمبر لیتے رہے ہو؟'' میں نے جواب دیا ہر امتحان میں سو نمبروں میں سے سو ہی لیتا رہا ہوں۔ اس پر انہوں نے میری طرف غور سے دیکھا اور اپنے سامنے پڑا ہوا ایک کاغذ اُٹھایا اور اس پر کچھ لکھ کر میری طرف بڑھایا اور کہا ''یہ لو یہ سوال حل کر کے دکھاؤ'' مجھے ایک طرف بٹھا کر اگلا لڑکا بلا لیا۔ سوال دیکھ کر تھوڑی دیر کے لیے تو میں پریشان ہوا لیکن پھر حوصلہ کر کے وہ سوال حل کرنے لگا۔ حل کر کے ڈرتے ڈرتے میں نے وہ کاغذ انہیں پیش کیا تو انہوں نے اس پر بہت بڑا 100/100 لکھا اور میری کمر پر اپنے ہاتھ سے شاباش دی اور ساتھ ہی کہا کہ تھرڈ ایئر میں تمہاری فیس معاف ہوگی۔ مجھے اپنی کمر پر ان کے اس ہاتھ کا لمس آج تک محسوس ہوتا ہے۔ یہ لمس میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔

ارژنگ: ابتدا میں ادبی حوالے سے کن ادیبوں سے متاثر تھے؟

عاشق رحیل: دوران تعلیم ہی مجھے کتابیں پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ سکول اور کالج کے لائبریریز سے میری دوستی ہوتی تھی۔ اس زمانے میں ''آنہ لائبریریوں'' کا بھی بڑا رواج تھا۔ لوگ ان لائبریریوں سے ضخیم سے ضخیم کتاب لے کر بھی ایک دن میں ختم کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تیرتھ رام فیروز پوری کے جاسوسی ناول بہت مقبول تھے۔ پھر عمران سیریز آ گئی۔ عبدالحلیم شرر، قیس رام پوری اور ایم اسلم کی کتابیں شوق سے پڑھی جاتیں۔ اسی زمانے میں نسیم حجازی کے تاریخی ناولوں کی دھوم تھی۔ شروع شروع میں مجھے بھی تیرتھ رام فیروز پوری اور نسیم حجازی بہت پسند تھے۔ عبدالحلیم شرر کا ناول ''فردوس بریں'' بھی کئی دفعہ پڑھا تھا۔ نسیم حجازی کے ناولوں کے تو کئی فقرے زبانی یاد ہو جاتے تھے۔ پھر اے حمید کی سب کتابیں پڑھ ڈالیں۔ شوکت تھانوی کی ہر کتاب کی تلاش رہتی تھی۔ ان کے مزاحیہ ناولوں کا بہت لطف آتا تھا۔ ایک زمانہ ایسا آیا کہ اردو تنقید کی کتابیں پڑھنی شروع کر دیں۔ آل احمد سرور، وقار عظیم، ممتاز حسن اور دوسرے بہت سارے نقاد زیر مطالعہ رہے جن کے اب نام بھی یاد نہیں آ رہے۔ پڑھنے کے ذوق میں ذرا نکھار آیا تو کرشن چندر، عصمت چغتائی، خواجہ غلام عباس، سعادت حسن منٹو، راجندر سنگھ بیدی، بلونت سنگھ، گوپال متل اور پتہ نہیں کس کس ادیب کو پڑھا لیکن اردو افسانے کے حوالے سے کرشن چندر اور منٹو بہت محبوب رہے۔ اب اردو میں کوئی قابل ذکر ناول لکھا ہی نہیں جا رہا۔ ''اداس نسلیں'' اور ''آگ کا دریا'' پرانے ہو گئے۔ مزاح میں شفیق الرحمٰن اور ضمیر جعفری بہت پسند تھے۔

ارژنگ: پرانے لاہور کی ادبی فضا اور آج کے لاہور کی ادبی فضا میں کیا فرق ہے؟

عاشق رحیل: پرانے لاہور کی آبادی کم تھی لیکن اس کے باوجود ادبی محفلوں کا چرچا رہتا تھا۔ پاک ٹی ہاؤس میں سارا دن ادیبوں شاعروں کی گہما گہمی رہتی تھی۔ ٹی ہاؤس میں ادبی دوستوں کی میزیں مخصوص ہوتی تھیں۔ عام آدمی یا چھوٹا موٹا ادیب وہاں جانے کی جرات نہیں کرتا تھا۔ اس زمانے میں وہاں ادبی اجلاس نہیں ہوتے تھے۔ حلقہ ارباب ذوق اور حلقہ ارباب علم جسے ریلوے والوں کا حلقہ بھی کہا جاتا تھا کے اجلاس وائی ایم سی میں ہوتے تھے اور کچھ تنظیمیں اپنے اجلاس اور مشاعرے چائنیز لنچ ہوم کے بیسمنٹ میں کرتے تھے۔ اس طرح پنجابی ادبی سنگت کا تنقیدی اجلاس وائی ایم سی اے کے بورڈ روم میں اور پنجابی ادبی پروار کا چائنیز لنچ ہوم میں ہوتا تھا۔ ان کے بعد ایک اور ادبی تنظیم ''حلقہ تصنیف ادب'' کے نام سے شروع ہوئی تو یہ اپنے اجلاس گرین ہوٹل میکلیگن روڈ میں کرتی تھی۔ اب تو ادیبوں اور تنظیموں کی بھرمار ہو چکی ہے۔ ایک ہی وقت میں کئی کئی تنقیدی اجلاس اور مشاعرے ہو رہے ہوتے ہیں جس نوجوان نے بھی ایک غزل یا ایک افسانہ لکھ لیا چاہے وہ کیسا ہو وہ ادیبوں اور شاعروں کی صف میں سمجھا جاتا ہے۔ آج ادب کو نہیں ادیب کو دیکھا جاتا ہے ایسے ایسے لوگ ادبی تنظیمیں چلا رہے ہیں جنہیں ادب سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ ان کے دماغ میں چاہے کچھ نہ ہو لیکن جیب میں ضرور ہو۔ اس وقت ادب پڑھنے کا رجحان ہوتا ہے لیکن آج ادیب بھی پڑھتے بہت کم ہیں۔

ارژنگ: پنجابی کے ادیب اُردو زبان کے حوالے سے اتنے متشدد کیوں ہیں؟

عاشق رحیل: یہ بات میں نے آپ ہی سے سنی ہے۔ میں نے کسی پنجابی ادیب کو اردو زبان پر تشدد کرتے نہیں دیکھا۔ اُردو زبان کی جتنی نشوونما پنجاب میں ہوئی ہے کہیں نہیں ہوئی۔ پنجاب کے کونے کونے میں اردو شاعر اور ادیب مل جائیں گے جو بلا دھڑک اپنی تخلیقات پیش کر رہے ہیں۔ پنجاب کے قصبوں سے اُردو زبان کے ادبی رسالے شائع ہو کر قارئین تک پہنچتے ہیں۔ پنجابی کے ادیب اپنی ماں بولی پنجابی کے حق کے لیے ضرور پرامن مظاہرہ کرتے ہیں۔ میرے ذہن میں تو آج تک کوئی ایسا واقعہ نہیں جس میں اردو زبان پر تشدد کیا گیا ہو۔ اگر آپ کوئی جانتے ہیں تو بتایئے؟

ارژنگ: کیا پنجابی میں ایسی صلاحیت ہے کہ وہ ہماری گھریلو معاشی اور دفتری زبان بن پائے؟

عاشق رحیل: ابھی تو اردو زبان میں بھی ایسی صلاحیت نہیں سمجھی جاتی کہ اسے دفتروں میں جگہ دی جائے۔ حالانکہ عدالت نے بھی اس کے حق میں فیصلہ دیا ہوا ہے کہ اسے دفتری زبان بنایا جائے لیکن متعلقہ لوگ اس پر عمل نہیں کرتے۔ پنجابی زبان ہماری گھریلو اور معاشی ضروریات تو پوری کر رہی ہے لیکن دفتری صلاحیت رکھنا تو دور کی بات ہے جب تک یہ زبان پرائمری سطح سے پڑھائی جانی شروع نہیں کی جاتی اس میں وسعت اور گہرائی نہیں آ سکتی۔

ارژنگ: کیا پنجابی میں بہتر ادب تخلیق ہو رہا ہے یا اُردو میں؟

عاشق رحیل: یہ موازنہ بہت مشکل ہے۔ پنجابی ادب بہت کم اور اردو ادب زیادہ تخلیق ہو رہا ہے۔ پنجابی

شاعری تو کسی حد تک قابلِ ذکر ہے لیکن نثر پر تو ایک قسم کا جمود طاری ہے۔ پنجابی کہانی بہت کم لکھی جا رہی ہے۔ پچھلے سالوں میں زاہد حسن نے اردو زبان میں لکھے جانے والے ناولوں سے بھی اچھے ناول لکھے۔ پنجابی شاعری صوفی شاعروں کی گود میں پلی۔ یہ ان شاعروں کی دین ہے۔ پنجابی شاعری میں کافی سی حرفی اور بارہ ماہا جیسی صنف موجود ہے۔ اُردو شاعری میں تصوف نظر نہیں آتا۔

ارژنگ: اب تک آپ کی کتنی کتب شائع ہو چکی ہیں؟

عاشق رحیل: اب تک میری اٹھارہ کتابیں چھپ چکی ہیں جن میں سے میری دو کتابیں گورمکھی لپی میں انڈیا کے پنجاب سے بھی چھپیں۔ تین کتابیں ایڈٹ کیں۔ پندراں گورمکھی رسم الخط کی انڈیا اور کینیڈا کے دوستوں کی کتابیں اردو رسم الخط میں شائع کیں۔

ارژنگ: گلشن ادب کے کتنے برسوں سے لگاتار اجلاس ہو رہے ہیں اور اس کا مختصر تعارف قارئین کے لیے پیش کر دیں۔

عاشق رحیل: اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے گلشن ادب کے مشاعروں کو ہوتے پینتیس سال گزر چکے ہیں۔ اب یہ تنظیم چھتیسویں سال میں داخل ہو گئی ہے۔ 10 اپریل کو اس کا پینتیسواں سالانہ مشاعرہ ہمدرد ہال میں منعقد کیا گیا جس میں پنجاب کے تمام شہروں کے علاوہ صوبہ کے پی کے کے دو شہروں کوہاٹ اور بنوں سے بھی دو شاعر دوستوں نے شرکت کی۔ اس سالانہ مشاعرے میں سو کے قریب شعرا حضرات نے اپنا اپنا کلام سنایا۔ گلشن ادب کے ماہانہ مشاعرے ہر ماہ کے دوسرے ہفتے میرے غریب خانے پر ہوتے ہیں۔ گلشن ادب پبلی کیشنز کے تحت مختلف لکھاریوں کی اردو اور پنجابی زبان کی سو سے زیادہ کتابیں چھپ چکی ہیں۔ یہ کتابیں نو پرافٹ اور نو لاس کے حساب سے چھاپی جا رہی ہیں۔ یہ ادارہ ان دوستوں کے لیے مددگار ثابت ہوتا ہے جو پروفیشنل پبلشرز کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے۔

ارژنگ: کینیڈا آپ ہر سال جاتے ہیں وہاں کے ادبی ماحول اور یادوں کو قارئین سے شیئر کیجیے۔

عاشق رحیل: اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہر سال کینیڈا اور امریکہ کا چکر لگتا ہے۔ کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں پہنچ کر یوں لگتا ہے جیسے دوسرے پنجاب بلکہ اصلی پنجاب میں آ گیا ہوں۔ گوروں کی نسبت پاکستانی اور ہندوستانی لوگ پنجابی اور اردو بولتے زیادہ نظر آتے ہیں۔ یہاں اردو اور پنجابی کی بہت ساری تنظیمیں ادبی پروگرام کرتی رہتی ہیں۔ مشاعرے، مذاکرے اور کتابوں کی رونمائیاں ہوتی رہتی ہیں۔ دونوں زبانوں کے ریڈیو اور ٹی وی سٹیشنز دن رات اپنی نشریات پیش کرتے رہتے ہیں۔ صرف اسی ایک شہر سے پندرہ سے زیادہ اردو اور تقریباً اتنے ہی پنجابی کے اخبار نکلتے ہیں۔ جو ہفت روزہ ہوتے ہیں اور ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ مجھے اکثر پنجابی انجمنوں کے اجلاس میں جانے کا موقع ملتا ہے۔ ان میں بہت لوگ شرکت کرتے ہیں۔ تین چار تنظیموں کے نام پیش کرتا ہوں۔ ''القلم فاؤنڈیشن''، ''کینیڈا ساہت سبھا ٹورانٹو''، ''قلم قافلہ'' اور ''پنجابی فاؤنڈیشن'' جس کے کرتا دھرتا لاہور سے گئے طاہر اسلم گورا صاحب ہیں۔ وہ ایک دو سال سے TAG ٹی وی اسٹیشن بھی کامیابی سے چلا رہے ہیں۔ کینیڈا میں اردو اور پنجابی ادب کو بہت فروغ دیا جا رہا ہے لیکن آپ کے پاس اتنا وقت نہیں کہ میں تفصیل میں جا سکوں۔ امریکہ کے شہروں میں بھی جہاں جہاں میں جاتا ہوں وہاں کے ادبی پروگراموں میں شرکت ہوتی رہتی ہے۔

ارژنگ: آپ کو اب تک کتنی قومی ادبی ایوارڈز سے نوازا جا چکا ہے؟

عاشق رحیل: قومی ایوارڈ بہت بلندی پر پڑے ہوتے ہیں لیکن میرے پاس اتنی لمبی اور مضبوط سیڑھی نہیں ہے کہ میں ان تک آسانی سے پہنچ سکوں یا پھر میں نے قوم کی اتنی خدمت کی ہی نہیں کہ ان تک رسائی ہو۔

ارژنگ: پنجابی کے حوالے سے بہت سی ادبی تنظیمیں ہیں جو کہ ہر پلیٹ فارم پر اپنی ماں بولی کے لیے آواز بلند کرتی ہیں۔ پنجاب پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ بھی ہے کیا وجہ ہے کہ پھر بھی عملی طور پر کچھ ہوتا نظر نہیں آتا۔

عاشق رحیل: واقعی پنجابی کی بہت ساری تنظیمیں ہیں جو اس زبان کو ترقی دینے کی بہت کوشش کرتی رہتی ہیں۔ پنجابی کتابوں پر ایوارڈ بھی دیے جا رہے ہیں۔ 21 فروری کو جب ''مادری زبانوں'' کا دن پوری دنیا میں منایا جاتا ہے تو کچھ پنجابی سیوک بھی ماں بولی کے حق میں احتجاج کے لیے نکل پڑتے ہیں۔ پاکستان کے اتنے بڑے صوبے میں جس میں بہت بڑے بڑے اور بھی بہت شہر ہیں لیکن یہ احتجاج صرف لاہور میں ہی ہوتا ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ اپنی زبان و ادب کی بہتری کے لیے پورا پنجاب اُمڈ پڑے لیکن ایسا ہوتا نہیں۔ دنیا میں واحد پنجاب ہی ایسا بدنصیب صوبہ ہے جس کے پرائمری سکولوں میں طالب علموں کو اپنی مادری زبان نہیں پڑھائی جاتی۔ عوام حکومت کے سامنے بے بس ہیں۔ حالانکہ مطالبہ کرنے والے بھی پنجابی ہیں اور مطالبہ ماننے والے بھی پنجابی ہیں۔ پھر بھی مطالبہ نہیں مانا جاتا۔ ہو سکتا ہے کہ عوام اور خواص میں فرق میں کوئی مصلحت ہو۔

ارژنگ: آپ پنجابی کے ادیب کی پہلی ذمہ داری

کیا سمجھتے ہیں؟

عاشق رحیل: میرے نزدیک پنجابی ادیب کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پنجابی ادب پڑھے بھی۔ ہمارے نوجوان لکھنے کی طرف تو بڑے شوق آ جاتے ہیں لیکن جس فیلڈ میں وہ لکھ رہے ہوتے ہیں اُس میں اپنے سینئر ادیبوں کے نام تک سے واقف نہیں ہوتے اور ان کا لکھا ہوا ادب پڑھنا تو دور کی بات ہے۔ چنانچہ میری پنجابی لکھنے والوں سے یہی استدعا ہے وہ کچھ لکھنے سے پہلے اُس سے متعلقہ معیاری ادب ضرور پڑھیں اور کتاب سے ناطہ جوڑے رکھیں۔

ارژنگ: پنجابی زبان کا اپنا رسم الخط کیوں نہیں ہیں؟

عاشق رحیل: کون کہتا ہے کہ پنجابی کا رسم الخط نہیں ہے؟ اس کے تو ایک کی بجائے دو رسم الخط ہیں۔ ایک رسم الخط کو "شاہ مکھی" اور دوسرے کو "گورمکھی" کہا جاتا ہے۔ گورمکھی میں تو دیگر لٹریچر کے علاوہ سکھ حضرات کی مذہبی کتاب مقدس "گورو گرنتھ" بھی موجود ہے۔ اس کے علاوہ ان کی بہت سی گربانیاں، اشلوک اور اُداسیاں اسی رسم الخط میں ملتی ہیں۔ دوسرے رسم الخط شاہ مکھی میں صوفی اور کلاسیکل شاعروں کا دیا ہوا ادبی خزانہ موجود ہے۔ بابا فرید، شاہ حسین، بلھے شاہ، وارث شاہ، سلطان باہو، میاں محمد، حافظ برخوردار، شاہ فرید اور بہت سے پنجابی ادیبوں اور شاعروں نے اپنی تخلیقات اس رسم الخط کے ذریعے پیش کرتے ہوئے کوئی دقت محسوس نہیں کی۔ اب جو حضرات پنجابی لکھنا ہی نہیں چاہتے وہ ایسے بہانے ضرور پیش کرتے ہیں کہ پنجابی کا اپنا کوئی رسم الخط نہیں۔ ہاں کچھ الفاظ ضرور ہیں جن کے لکھنے میں دقت پیش آتی ہے۔ اگر پنجابی کے کچھ ماہر ادیب اس ضمن میں سر جوڑ کر بیٹھیں تو دقت بھی بڑی آسانی سے دور ہو سکتی ہے۔

ارژنگ: آپ نے زندگی میں کبھی محبت کی ہے۔ کس سے؟

عاشق رحیل: محبت ضرور کی ہے اور ڈنکے کی چوٹ کی ہے لیکن میری محبت وہ نہیں تھی جو پہلی نظر میں ہی ہو جاتی ہے۔ ایسی محبت دوسری نظر میں ختم بھی ہو جاتی ہے۔ میں نے پہلی نظر میں صرف جائزہ لیا اور پھر اس کی سچائی اور مضبوطی جانچنے میں دو سال لگا دیے۔ چنانچہ آج میری اُس محبت کا نتیجہ میرے چار خوبصورت اور فرمانبردار بیٹوں کی صورت میں دیکھا جا سکتا ہے۔ ان چاروں بیٹوں اور ان کی ماں نے میری زندگی کو جنت بنایا ہوا ہے اور میں اپنے آپ کو خوش قسمت "عاشق" سمجھتا ہوں۔ میری بیوی میری شاگرد تھی۔ میں گورنمنٹ کالج چارسدہ میں ریاضی پڑھاتا تھا۔ ایک دن میری بیوی کے والد کالج تشریف لائے اور انہوں نے اپنی بیٹی کے لیے ریاضی پڑھانے کے لیے کہا جو اس وقت وہاں کے سکول میں پڑھ رہی تھی۔ کالج میں سارے دن میں 80 منٹ کی صرف دو کلاسیں ہوتی تھیں اور پھر کتابیں ہوتیں اور میں۔ چنانچہ وقت کی بہتات دیکھ کر میں نے ان سے حامی بھر لی اور ان کی بیٹی کو ریاضی پڑھانی شروع کر دی۔ وہ ریاضی سے بہت ڈری ہوئی تھی اس لیے اسے پڑھنے کے علاوہ اور کسی بات کی خبر ہی نہیں تھی۔ چار پانچ دنوں میں اس نے خوب توجہ سے ریاضی سیکھی۔ مجھے اس کی نشست و برخاست، بات چیت کا انداز، اُستاد کی عزت اور سب سے بڑی بات اس کا سراپا اچھا لگا اور میں نے اپنے دل میں محبت کا بیج بو دیا جو آہستہ آہستہ سر نکالنے لگا اور دو سالوں میں شجر سایہ دار بن گیا۔ ان دنوں میری شادی کا چرچا ہوا تو میں نے اس لڑکی کے بارے میں کہا۔ والدہ نے بھی لڑکی کو پسند کیا اور اس طرح آج یہ لڑکی میری پہلی اور آخری محبت بن کر میرے پاس بیٹھی ہے۔

ارژنگ: زندگی کا کوئی یادگار واقعہ؟

عاشق رحیل: جب پاکستان معرضِ وجود میں آیا تو ہندوستان سے پاکستان آنے والے مہاجروں کا ایک لمبا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ٹرک، بسیں اور ریل گاڑیاں کم پڑ گئیں۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد کو ریل گاڑی کی چھت پر بیٹھ کر سفر کرنا پڑتا تھا۔ جب ہماری پاکستان آنے کی باری آئی تو مجھے بھی اپنے ماموں کے ساتھ گاڑی کی چھت پر بیٹھنا پڑا۔ جب کوئی سٹیشن آتا تو اوپر بیٹھنے والے لوگ یا تو لیٹ جاتے یا سر نیچا کر لیتے۔ کیونکہ ریلوے لائن کے اوپر سے گزرنے والی بجلی یا ٹیلیفون کی تاروں سے سر ٹکرانے کا خطرہ تھا۔ میں بھی اس پر عمل کرتا رہا لیکن ایک سٹیشن پر میں اس طرح کرنا بھول گیا۔ چنانچہ اوپر سے گزرنے والی تار میری گردن سے اس طرح ٹکرائی کہ میں اپنا توازن قائم نہ رکھ سکا اور میرا پورا جسم گاڑی کی چھت سے نیچے کی طرف لڑھک گیا لیکن میری زندگی ابھی باقی تھی۔ چنانچہ اچانک میری ایک ٹانگ میرے ماموں کے ہاتھ میں آ گئی اور انہوں نے مجھے اُوپر کی طرف کھینچ لیا۔ میری زندگی تو بچ گئی لیکن میری گردن کا بہت برا حال تھا۔ گاڑی نے پاکستان جا کر ہی رُکنا تھا۔ اس طرح اس سفر میں جو تکلیف مجھے ہوئی وہ ابھی تک نہیں بھولی۔

ارژنگ: ارژنگ کے قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

عاشق رحیل: ارژنگ کے قارئین سے میرا یہی پیغام ہے کہ وہ اسے دل لگا کر پڑھیں بھی۔ ادب کے قارئین کے لیے یہ ایک بہت عمدہ تحفہ ہے۔ تحفے کی قدر کرنی چاہیے۔

مختصر ادبی خبریں/تقریبات

آہ! فرزانہ ناز

فرزانہ ناز (مرحومہ) کا تعزیتی ریفرنس ۳ مئی ۲۰۱۷ء کو آرٹس کونسل آڈیٹوریم راولپنڈی میں ہوا جس میں اسلام آباد اور راول پنڈی کے علاوہ ملک بھر سے شعرائے کرام، ادیبوں، صحافیوں اور فن کاروں نے شرکت کی اور مرحومہ کی زندگی اور شاعری کے حوالے سے گفتگو کی۔ تعزیتی ریفرنس کے دوران ہال کی فضا سوگوار رہی۔ اس موقع پر فرزانہ ناز کی کتاب ''ہجرت مجھ سے لپٹ گئی ہے'' کی تقریب پذیرائی بھی ہوئی۔

ایم اے راحت کا انتقال

لاہور میں مقیم نامور ناول نگار ایم اے راحت گزشتہ دنوں خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ کچھ عرصہ سے علیل تھے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی مغفرت فرمائے اور انھیں جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین

اُستاد پرنم الہ آبادی کی آٹھویں برسی کے موقع پر بزمِ پرنم پاکستان رجسٹرڈ کے زیرِ اہتمام عظیم الشان محفل موسیقی اور عالمی مشاعرہ

اُستاد پرنم الہ آبادی کی آٹھویں برسی کے موقع پر عظیم الشان محفل موسیقی اور عالمی مشاعرہ الحمرا ہال نمبر 3 میں منعقد ہوا۔ جس کی صدارت سیّد سلمان گیلانی نے کی۔ پہلا حصہ محفل موسیقی تھا جس کے مہمانِ خصوصی نامور مصنف ہدایت کار محمد پرویز کلیم تھے۔ دوسرا حصہ عالمی مشاعرہ تھا اس کے مہمانانِ خصوصی میں کیپٹن (ر) عطا محمد خان، علی اصغر عباس، زیب النساء زیبی، حسن عباسی، اقبال راہی، ڈاکٹر عمرانہ مشتاق اور لبنیٰ صدر شامل تھیں۔

مہمانانِ اعزاز میں ریاض شاہد (بحرین)، ادریس لاہوری (ناروے)، ارشد نذیر ساحل (اسپین)، حکیم اسلم قمر (سعودی عرب) شامل تھے۔ مہمانانِ گرامی میں ابرار اسیر، سیّد محسن جعفر، اے جے رانا، پروفیسر افضل خان راہی، شیخ اقبال محمود، رفعت علی علوی اور سیدتاثیر رضا شامل تھے۔

تلاوت قرآن حکیم کے بعد اُستاد پرنم کا کلام ممتاز قوال خرم فرید صابری نے ''بھر دو جھولی میری یا محمدؐ'' سنا کر سماں باندھ دیا۔ احمد علی خاں قوال نے اُستاد پرنم الہ آبادی کی نعت سنا کر حاضرین سے داد وصول کی۔ اس کے بعد استاد پرنم کی شہرہ آفاق غزل ''تمہیں دل لگی بھول جانی پڑے گی'' سنا کر سامعین کے دل موہ لیے۔ معروف کامیڈین چکیلا نے خصوصی آئٹمز پیش کر کے خوب داد وصول کی۔ محفل موسیقی کے آخر میں اُستاد ناصر علی خاں نے پرنم الہ آبادی اور پرنم الہ آبادی کے ہونہار شاگرد محمد اقبال پیام کی غزلیں پیش کیں۔ عالمی مشاعرہ میں ابرار اسیر (کراچی)، جہاں آرا تبسم (کوئٹہ)، سعد احمد سعد (گوجرانوالہ)، اسد عباس راز (کھاریاں)، شبیر رحمانی (بہاولپور)، سیّد نجیب شاہ (اسلام آباد)، رانا نیئر اقبال (پیرس)، ہمایوں پرویز شاہد، زاہد محمود شمس، ڈاکٹر سعید اُلفت، زاہد صدیقی، نواز انجم، زاہد انجم میو شامل تھے۔

مقررین نے اُستاد پرنم الہ آبادی کی شخصیت اور شاعری کے حوالے سے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے انہیں عاشق رسول قرار دیا اور ان کی غزلیات پر بھی سیر حاصل گفتگو کی۔ تقریب کے میزبان اُستاد پرنم الہ آبادی کے شاگرد عزیز محمد اقبال پیامؔ نے پرنم الہ آبادی کی شخصیت اور کام کے حوالے سے گفتگو کی۔ بزمِ پرنم کے تحت ہونے والی سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ اقبال راہی نے پرنم الہ آبادی کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات کا ذکر کرتے ہوئے کہا وہ اس وقت بھی استاد کا درجہ رکھتے تھے۔

حسن عباسی نے دنیا بھر سے آئے شعرا کا شکریہ ادا کیا۔ مہمان شعراء نے اپنا کلام بھرپور انداز سے سنایا۔ سیّد سلمان گیلانی نے 45

منٹ اپنا صدارتی کلام سنا کر مشاعرہ کو یادگار بنا دیا۔

اس پروگرام کی نقابت نامور شاعر ادیب اور کمپیئر ڈاکٹر ایم ابرار نے کی۔ یہ پروگرام 6 گھنٹے جاری رہا۔ یہ ہر لحاظ سے یادگار پروگرام تھا۔ تمام مہمانوں کو شرکت کے خصوصی سرٹیفکیٹ پیش کیے۔ آخر تک بڑی تعداد میں حاضرین موجود رہے۔ سب نے اقبال پیام اور حسن عباسی کو ایسا یادگار پروگرام منعقد کرنے پر مبارک پیش کی۔ آخر میں بزم اللہ آبادی کے لیے دعائے مغفرت کروائی گئی۔

اختتام پر حاضرین کے لیے طعام کا خاص انتظام کیا گیا۔

بک رائٹرز کلب کے زیر اہتمام افضال نوید کی کتابوں کی تقریب رونمائی لاہور آرٹس کونسل ادبی بیٹھک میں منعقد ہوئی

(لاہور پ ر) اُردو کے شاعر افضال نوید کے تین شعری مجموعوں کی تقریب رُونمائی ادبی بک رائٹرز کلب لاہور کے زیر اہتمام ادبی بیٹھک لاہور آرٹس کونسل مال روڈ لاہور منعقد ہوئی۔ اس تقریب کی صدارت معروف شاعر سعادت سعید نے کی۔ اس تقریب سے غلام حسین ساجد، زاہد مسعود، رانا عبدالرحمٰن، ڈاکٹر افتخار بخاری، شفیق احمد خان، ڈاکٹر ضیاء الحسن اور ڈاکٹر امجد طفیل نے اظہار خیال کیا۔

اس تقریب میں ادیبوں، شاعروں، دانشوروں، صحافیوں اور دیگر شعبہ ہائے زندگی سے تعلق رکھنے والی جن اہم شخصیات نے شرکت کی ان میں بک رائٹرز کلب کے سیکرٹری جنرل ایم سرور، معروف اداکار اور رائٹر اطہر مسعود، بشیر شاد، عابد حسین عابد، زاہد حسن، امتیاز بخاری، سرفراز سید، قائم نقوی، عاطف رحمان، شہزاد فراموش، میم سین بٹ، عمر امتیاز فخر عالم، زوہیب خان، سعد بھٹی، عدیل قریشی، ذیشان علی، زاہد رشید، وقاص، ارشاد اور ریاض صحافی شامل ہیں۔

ملتان میں ممتاز راشد لاہوری کے ناول کی رونمائی

ملتان کی دو ادبی تنظیموں ''قلم حروف دوست'' (نعیم کاظمی) اور ملتان لٹریری کلب (راؤ وحید اسد) نے اکادمی ادبیات ملتان کے اشتراک سے 16 اپریل 2017 کو ممتاز راشد کے ناول ''نازی نواز'' کی تقریب رونمائی منعقد کی۔ صدارت ڈاکٹر شوذب کاظمی، مہمانانِ خصوصی: ڈاکٹر مختار ظفر، ایم ڈی گل، اظہر سلیم مجوکہ، سجاد جہانیاں، پروفیسر نسیم شاہد، ڈاکٹر سجاد نعیم اور اکادمی ادبیات لاہور کے ڈپٹی ڈائریکٹر محمد جمیل، نظامت کے فرائض راؤ وحید اسد نے ادا کیے اور ممتاز راشد کا جامع تعارف بھی پیش کیا۔ مدثر شمن کی تلاوت قرآن کے بعد سجاد ملک نے ترنم سے یہ نعت سنائی: جب مسجد نبوی کے مینار نظر آئے

استقبالیہ کلمات نعیم کاظمی نے ادا کیے۔

ممتاز راشد کے خوشخصیت اور خصوصی طور پر مذکورہ ناول کے حوالے سے گفتگو کرنے والوں میں میراں محل کے علاوہ پروفیسر قیصر ہاشمی، عاظم خاکوانی، رانا اسلم ساغر، قمر ہاشمی (ریڈیو ملتان) محمد نصیر ہمایوں، یاسمین خاکوانی اور اکادمی ادبیات ملتان کے ڈائریکٹر اقبال ڈھراج شامل تھے۔

ادبی رپورٹ

بزمِ انجم رومانی پاکستان کے زیر اہتمام ممتاز شاعر نیازت علی نیاز کی کتاب ''حوالہ'' کی تقریب پذیرائی۔

4 فروری 2017ء کو الحمرا ادبی بیٹھک میں ممتاز شاعر نیازت علی نیاز کی شاعری کی کتاب حوالہ کی تقریب پذیرائی منعقد کی گئی۔ جس کی صدارت نامور شاعر باقی احمد پوری نے کی۔

مہمانانِ خصوصی میں ڈاکٹر ایوب ندیم، پروفیسر شفیق احمد خان، تسنیم کوثر اور پروین سجل شامل تھیں۔

نظامت کے فرائض بزمِ انجم رومانی پاکستان کے صدر ڈاکٹر ایم ابرار نے سرانجام دیے۔ کتاب کے حوالے سے عقیل اختر، محمد ممتاز راشد لاہوری اور حسن عباسی نے بھی گفتگو کی۔ تلاوتِ قرآن پاک کی سعادت مدثر اعظمی نے حاصل کی اور ذاکر خواجہ نے نعت رسولِ مقبولؐ پیش کی۔

تبصرۂ کتب/فلیپ/آراء

نام کتاب: مرے ہم سفر مرے پیش رو/شاعر: خالق آرزو/صفحات: 160 / قیمت: 400روپے/تبصرہ نگار: ضیا شہزاد
ناشر: الاشراق، 6 بنگالی گلی، گنپت روڈ، اُردو بازار لاہور

خالق آرزو صاحب کے کئی آرٹیکل اتنے عمدہ ہیں کہ بے ساختہ میں پڑھ کر عش عش کرنے پر بھی مجبور ہوا ہوں۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ سخن طرازی کے فن میں یہ جس قدر بلند قد و قامت کے مالک ہیں اسی قدر مجھ جیسے گوشہ نشین اور کم علم شخص کے لیے ان کی کسی تحریر کے مجموعے پر اظہار خیال کرنا جرأت رندانہ سے کم نہیں ہے۔ یہاں اس کی تفصیل میں جانا میرا مقصد نہیں ہے بلکہ اہل نظر دوستوں کو یہ بتانا ہے کہ اس کتاب کے مصنف نے تحریر کا جادو بڑی کمال مہارت سے جگایا ہے۔ جب آپ یہ کتاب ''مرے ہم سفر مرے پیش رو'' مطالعہ فرمائیں گے تو ان کے کمال فن پر داد دیے بغیر نہ رہ سکیں گے۔

نام کتاب: دل کا نخلستان/شاعر: رفیع الدین راز/صفحات: 176 / قیمت: 400روپے/تبصرہ نگار: شاعر علی شاعر
ناشر: رنگِ ادب پبلی کیشنز، اُردو بازار کراچی

جس طرح سیلاب اپنے تیز و تند بہاؤ کے سبب اپنے راستے میں آنے والی تمام اشیا کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اسی طرح رفیع الدین راز کے قلم کی طغیانی اپنے ساتھ تمام اصناف سخن کو لے کر آگے بڑھ رہی ہے۔ رفیع الدین رازؔ کی وجہ شہرت غزل گوئی ہے جس میں انھیں عالمی سطح پر مانا اور جانا جاتا ہے مگر انھوں نے دیگر اصناف سخن میں بھی اپنا زور بیان دکھایا ہے اور اپنا فن آزمایا ہے۔ انھوں نے نظم کہی ہو یا غزل، ماہیے لکھے ہوں یا تروینی، حمد و نعت لکھی ہو یا منقبت، افسانے لکھے ہوں یا انشائیے سبھی تحریروں میں ان کا معیار برقرار رہا ہے۔ مقدار اور معیار ہر دو کے لحاظ سے ان کی تخلیقات اُردو ادب میں اضافے کا باعث ٹھہری ہیں۔ رفیع الدین رازؔ نے آج تک 20 نثری و شعری کتابیں اُردو ادب کو دے کر اردو ادب کے دامن کو مالا مال کیا ہے۔ رفیع الدین رازؔ کی بیسویں کتاب ''دل کا نخلستان'' ہائیکو کا مجموعہ ہے جس میں 700 ہائیکوز شامل ہیں۔

نام کتاب: درآئینہ/شاعر: رفیع الدین راز/صفحات: 200 / قیمت: 400روپے/تبصرہ نگار: ڈاکٹر جاوید منظر
ناشر: رنگِ ادب پبلی کیشنز، اُردو بازار کراچی

رفیع الدین رازؔ کا فلسفہ حیات اور نظریہ کائنات ان کی غزلوں میں حسن بیاں کے ساتھ موجود ہے۔ محاورے کی بندش، فکری چستی اور لسانی پختگی نے ان کی غزلوں کو بے نظیر بنا دیا ہے۔ ان کی غزلوں میں وہ تمام محاسن ملتے ہیں جن سے شاعری بلند اور ارفع ہوتی ہے۔ راز آج دبستان کراچی کے اہم ادبی معماروں میں شامل ہیں۔ ان کے منفرد لہجے، نئی تراکیب اور نئے اسلوب نے انھیں اردو دنیا کے صف اوّل کے شعرا میں جگہ دلا دی ہے۔ وہ آج کے معتبر شعرا کی بزم میں ایک اعلیٰ ادبی مقام رکھتے ہیں۔ ان کی وسیع شاعرانہ صلاحیت نے انھیں لمحہ موجود میں جس منصب پر فائز کر دیا ہے اکثر شعرا اس کا صرف خواب ہی دیکھ سکتے ہیں۔ ''درآئینہ'' ان کے فن کا ایک رفیع الشان مظاہرہ ہے۔ ان کی غزلوں نے اردو غزل کی ایک نئی تاریخ رقم کر دی ہے۔ میں رفیع الدین راز کو دبستان کراچی

کے غزل گویوں میں سب سے الگ اور ممتاز سمجھتا ہوں۔

نام کتاب: روشنی کے خدوخال/ شاعر: رفیع الدین راز/صفحات: 224 / قیمت: 500 روپے/تبصرہ نگار: شاعر علی شاعر
ناشر: رنگ ادب پبلی کیشنز، اردو بازار کراچی

رفیع الدین رازؔ کی شاعری پڑھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خالق کائنات کی مدد ان کی شامل تخلیق رہتی ہے۔ وہ یقیناً اللہ تبارک وتعالیٰ کے چہیتے بندے ہیں تبھی تو رب ذوالجلال ان کے ذہن میں ندرت خیال کے مختلف پہلو اور نت نئے زاویے اُجاگر کرتا ہے اور ان کو ایسے ایسے اعلیٰ خیالات سے نوازتا ہے جو ان کے ہم عصر شعرا کو بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ شانِ رزاقی کی یہ عطا رفیع الدین راز کو ان کے ہم عصر شعرا سے منفرد و ممتاز کر کے اعلیٰ مقام پر فائز کرتی ہے۔ رازؔ صاحب کا لہجہ غزل، نظم اور حمد و نعت میں ایک جیسی توانائی رکھتا ہے۔ ''روشنی کے خدوخال'' ان کا معرکہ آرا نعتیہ مسدس ہے جس کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔

نام کتاب: بھلیاں راہواں/ شاعر: صدام ساگر صفحات: 120 / قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: اقبال راہی
ناشر: عالم پبلی کیشنز، لاہور

صدام ساگر بڑی لگن، محنت، تے پیار نال اپنی ماں بولی دی خدمت شعراں راہیں کر رہے نیں۔ شعر دی رمزوں تے اوہدی اونچ نیچ نوں چنگی طرحاں سمجھدے نیں۔ ایناں دے شعراں وچ جہڑی روانی اے اوہ ایناں دے قادرالکلام ہون دا سب توں وڈا ثبوت اے۔ ایس مجموعے وچ صدام ہوراں اپنی سوچ تے فکر دا چانن بڑے بھرویں طریقے نال کھلاریا اے۔ میں اینا دی ترقی، کامیابی تے درازی عمر لئی خلوص دل نال دعا گوہاں تے رہواں گا۔

نام کتاب: حضورکی تمنا/ شاعر: مرتضیٰ ساجد/صفحات: 128 / قیمت: 300 روپے/تبصرہ نگار: پروفیسر سید ریاض حسین زیدی
ناشر: فریدیہ پریس، لیاقت چوک، ساہیوال

دنیا کی تاریخ ادب اور روداد ادیانِ عالم میں اس حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا کہ بانی اسلام حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی اور ان کی ان گنت صفات اور بے مثل کمالات کو ہر تذکرے اور ہر حوالے اور ہر پیرایے پر ہر لحاظ سے فوقیت حاصل ہے۔ سید عطاء اللہ شاہ بخاری ببانگ دہل کہا کرتے تھے کہ جس انداز اور جس پیار سے اللہ رب العزت نے اپنے محبوب ﷺ کا تذکرہ دل نواز کیا ہے اس کی مثال ڈھونڈنے سے نہیں ملتی۔ یہ بھی اعجاز مصطفیٰ ﷺ ہے کہ ساری دنیا میں ہر گھڑی جہاں خدا کی عظمت کے گن گائے جا رہے ہیں وہاں آپ ﷺ کی صفات عالیہ بھی نام خدا سے منسلک ہیں۔ لہٰذا قابل صد مبارک باد وہ خوش قسمت لوگ جو مدح رسول ﷺ بخیر و خوبی اپنی تحریروں کا جزو بنائے ہوئے ہیں۔ ان خوش نصیبوں میں ایک نام مرتضیٰ ساجد کا بھی ہے۔ میں نے مرتضیٰ ساجد کی نعتوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے۔ ان کا ایک ایک حرف ایک ایک نقطہ ہر ترکیب اور ہر عبارت کا بہ نظر عمیق جائزہ لیا ہے۔ مجھے مرتضیٰ ساجد کی اسی خوبی نے ان کا گرویدہ بنایا ہے کہ وہ کسی مقام پر بھی خدانخواستہ غیر شرعی بات ادا نہیں کرتے۔ ان کے انگ انگ سے حضور ﷺ سے محبت، اُلفت اور ان سے لگاؤ کو دل کی گہرائیوں سے مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ مرتضیٰ ساجد نے نعت لکھی ہے اور اس نے حرمت نعت کے تمام تقاضوں کو بخیر و خوبی مدنظر رکھا ہے اور کسی انداز سے بھی ان کی طلب کو مجروح نہیں ہونے دیا۔

نامہ ہائے احباب

پیارے حسن عباسی صاحب!

ارژنگ نظر، ارژنگ نما۔ ارژنگ کی ماشاءاللہ آب و تاب وہی ہے لیک جھپک بھی وہی، ٹائٹل کی سج دھج میں تو ارژنگ اسم رکھتا ہے۔ رسالے کے تخصیصی معمولات انفرادیت رکھتے ہیں۔ آپ ان کے استحکام اور بناؤ سنگھار میں دلچسپی لیتے ہیں۔ آپ کا شاعرانہ مزاج شعری حس انتخاب میں خاصا کارگر ہے۔ رخسانہ نور کی یاد میں ڈاکٹر کوثر محمود کا مضمون خاصا پراثر ہے۔ پھر بیک ٹائٹل پر عامر بن علی کا پارۂ غم رخسانہ نور کی رخصتی دل کو لگا۔ رخسانہ نور نے کڑے حالات کا سامنا کڑے دل سے کیا۔ ''ہنستے کھیلتے'' موت کو گلے لگا لیا۔ میں نے مرحومہ کی شاعری اتنی نہیں دیکھی۔ ارژنگ میں ایک گوشہ وقف ہو جائے تو کیسا ہے۔ خوشی کی بات ہے ''ارژنگ'' کو اچھے لکھنے والے ملے ہیں۔ ان کے خیالات اور احساسات بالکل مختلف تو نہیں نئے پن کی طرف مائل ضرور ہیں۔ اب کے تصویریں نہیں نکلیں۔ آپ کی اور عامر بن علی کی صورتیں تصویریں دیکھ دیکھ کے زبانی یاد ہو گئی ہیں۔ بہر طور کلام کا حسن اپنی جگہ...... آپ ارژنگ بھیجتے ہیں بڑی حوصلہ افزائی کی بات ہے۔ مہربانی آپ کی۔

خیر اندیش

آصف ثاقب، بوئی ہزارہ

محترم و مکرم جناب حسن عباسی مدیر ماہنامہ ''ارژنگ'' لاہور

السلام علیکم۔ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہو گا۔ اپنی حال ہی میں شائع ہونے والی کتاب ''بانگ جرس'' ارسال خدمت ہے۔ براہ کرم اس پر اپنے رسالے میں تبصرہ کر دیں۔ آپ کا ممنون و شکر گزار رہوں گا۔

قاسم جلال، لاہور

جناب حسن عباسی صاحب!

آداب! اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ''ارژنگ'' موصول ہو گیا شکریہ۔ سب سے پہلے تو رسید دینا ضروری ہے اور پھر یہ بتانا کہ کتنا عمدہ جریدہ ہے اور اس کی تحریریں بھی لاجواب۔ تقریباً بیٹھے بیٹھے ہی آدھے سے زیادہ رسالہ پڑھ گئی۔ اس میں اپنے فیورٹ رائٹر جناب عطاء الحق قاسمی صاحب کی کیسی بھی تحریر ہو پڑھ کر خوش ہو جاتی ہوں۔ افسانے بھی اچھے تھے اور شاعری تو لاجواب۔ ارژنگ بہت ہی عمدہ اور جاندار کوشش ہے۔ عامر بن علی صاحب کا انٹرویوز کا سلسلہ بہت عمدہ ہے۔ میرا اسلام عرض کیجیے گا۔ سلامت رہیے!

آسناتھ کنول، لاہور

پیارے حسن! یونہی عشق محبت میں گندھی شاعری کرتے رہو۔

ارژنگ مل گیا ہے۔ رخسانہ نور کی یاد نے پلکیں بھگو دیں۔ ڈاکٹر کوثر محمود نے رخسانہ نور کے ساتھ کچھ یادوں کو بڑی محبت سے ہم سب میں بانٹا ہے۔ یقیناً رخسانہ اسی محبت اور تعظیم کے قابل تھیں۔ اس بار ارژنگ میں تین سفرنامے شامل ہیں۔ وحید قندیل سے اس بار ملاقات نہ ہو سکی۔ ان کا تھائی لینڈ کا سفرنامہ خاصا دلچسپ ہے۔ عاشق رحیل کا ترے روبرو بھی عقیدتوں میں گندھا ہوا سفرنامہ ہے۔ بس ابھی تک ''ارژنگ'' کا اتنا ہی مطالعہ کیا ہے۔

والسلام

تسنیم کوثر، لاہور

برادرِ محترم حسن بھائی!

اسلام علیکم...... ارژنگ کے لیے کچھ چیزیں ارسال خدمت ہیں۔ از راہِ کرم شامل اشاعت کر لیجیے۔

آپ کی اور اوکاڑوی صاحب کی خدمت میں سلام۔

عزیز ندیم نیازی

محترم حسن عباسی صاحب!

اُمید ہے خیریت سے ہوں گے۔ ''ارژنگ'' کے لیے دو غزلیں اور مضمون ارسال کر رہا ہوں۔ شامل اشاعت فرما کر شکریہ کا موقع دیں۔

مخلص

جاوید صدیق بھٹی، لاہور

محترم حسن عباسی صاحب!

السلام علیکم۔ اُمید ہے مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ ماہنامہ ''ارژنگ'' جی سی یونیورسٹی فیصل آباد کی لائبریری میں پڑھنے کو ملتا ہے جس کے لیے جناب حسن عباسی اور ان کے ممبران خصوصی داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ کیونکہ ''ارژنگ'' واحد ایسا پرچہ ہے جو کہ نہایت ہی خوبصورت طریقے اور سلیقے سے شائع ہوتا ہے اور ''ارژنگ'' میں روز بہ روز ایک نیا نکھار دیکھنے کو ملتا ہے۔ دعا ہے کہ مالک ''ارژنگ'' اور جناب حسن عباسی کو دن دُگنی رات چگنی ترقی دے۔ آمین

بوجہ امتحانات ''ارژنگ'' سے رابطہ منقطع ہوا تھا۔ اب ہمارے امتحانات تقریباً ختم ہو گئے ہیں۔ صرف ایک دو پیپر باقی ہیں۔ اس لیے میں نے پہلی فرصت میں ہی ''ارژنگ'' کو خط لکھنا ضروری جانا۔ کیونکہ ہم لکھنے والے لوگ ''ارژنگ'' اور دوسرے ادبی رسائل و جرائد کی بابت زندہ ہیں۔

اس دفعہ ارژنگ کے لیے صرف دو غزلیں ارسال کر رہا ہوں اور اگلی بار یقیناً اک مضمون بھی ارسال کروں گا۔

اُمید ہے دونوں غزلیں ضرور پسند آئیں گی۔

جناب عباسی صاحب اک اپیل ہے کہ اگر آپ ہماری ''الکلام'' لائبریری جو کہ ہمارے علاقے کی واحد عوامی لائبریری ہے اس کے لیے ''ارژنگ'' ارسال فرمادیا کریں تو حضور کی عین نوازش ہوگی۔ ہمارے علاقائی ادبی دوست اور دوسرے دلچسپی رکھنے والے صاحبان بھی مستفید ہوں گے۔ ہو سکے تو لازمی مہربانی فرمائیے گا اور شکریہ کا موقع عطا فرمائیے گا۔

خیر اندیش

ساجد رضا خان

دوست

(چند ایک مخلص دوستوں سے معذرت کے ساتھ)

کون سا، کس کا، کہاں کا، کب کا دوست
ہے جہاں میں ہر کوئی مطلب کا دوست

اب مہینوں بھی نظر آتا نہیں
جو کبھی تھا میرے روز و شب کا دوست

اب کوئی مشکل میں کام آتا نہیں
کوئی اب کا یا ہو کوئی تب کا دوست

اب بنائیں تو بناتے بھی ہیں لوگ
کوئی اونچے رُتبہ و منصب کا دوست

درحقیقت وہ کسی کا بھی نہیں
وہ جو ہوتا ہے بظاہر سب کا دوست

یاد آ جاتا ہے گزرا دور بھی
جب بھی مل جائے کوئی مکتب کا دوست

آخرش تنہا ہی رہ جاتا ہے وہ
ہو کوئی جو اپنے ہی مطلب کا دوست

سن کے میرا نام وہ بولے سکون
چھوڑیے وہ بھی ہے کوئی ڈھب کا دوست

سلطان سکون

رنگ خوشبو سے جدا کس نے کیے
نقش واضح تھے ہوا کس نے کیے

میرے سجدے رہ گئے تو کیا ہوا
سارے سجدے ہاں ادا کس نے کیے

دکھ پرندوں کی طرح تھے دل میں قید
سوچتی ہوں یہ رہا کس نے کیے

چاند، سورج اور تارے دوست تھے
مجھ سے نالاں اور خفا کس نے کیے

نعمتِ عظمیٰ تھے یہ میرے لیے
زیست کے لمحے سزا کس نے کیے

موسموں کے لطف تھے سب سے جدا
بے وقعت یہ بدمزا کس نے کیے

قریہ قریہ ظلمتیں ہیں شہر میں
ظلم اتنے سعدیہ کس نے کیے

سعدیہ سیٹھی / برطانیہ

کوئی دیا ہوا کو بجھانے نہ دوں کبھی
ظلمت کو اپنا راج چلانے نہ دوں کبھی

ان بجلیوں کو روک رکھوں آسمان پر
ان آندھیوں کو پیڑ گرانے نہ دوں کبھی

جو لوگ اچھے ہیں وہ رہیں میرے آس پاس
جو میرے بس میں ہو انہیں جانے نہ دوں کبھی

اتنا خیال رکھوں میں اپنی زمین کا
دل اس کا آسماں کو دکھانے نہ دوں کبھی

ننھے دلوں کو ڈر سے بچاؤں کسی طرح
پیڑوں کو پنچھیوں سے اُڑانے نہ دوں کبھی

فطرت کے ساتھ جوڑ دوں میں سب کو سعدیہ
کاغذ کے پھول گھر میں سجانے دوں کبھی

سعدیہ سیٹھی / برطانیہ

ماہنامہ ''ارژنگ'' کو وصول ہونے والے ادبی جرائد

ماہنامہ طلوع اشک

چیف ایڈیٹر: رائے عابد علی

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

رابطہ: ۰۳۰۰-۴۸۵۰۴۶۱

....

ششماہی ترنجن

چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر اصغر صدف

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: پنجاب انسٹی ٹیوٹ آف لینگویج،

آرٹ اینڈ کلچر، نزد قذافی سٹیڈیم لاہور

....

ماہنامہ نوائے ادب

مدیرِ اعلیٰ: صدام ساگر

فی قیمت شمارہ: -/۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: ہسکن سنٹر بالمقابل دفتر فوڈ

سول ہسپتال روڈ، گوجرانولہ

....

ششماہی رنگِ ادب

مدیر: شاعر علی شاعر

قیمت فی شمارہ: -/۵۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: رنگِ ادب پبلی کیشنز

آفس نمبر ۵ کتاب مارکیٹ اردو بازار کراچی

ماہ نامہ مجلس ترقی ادب

مدیر: محمد ظہیر بدر

ملنے کا پتہ: نرسنگھ داس گارڈن کلب اڈا اپر مال لاہور

....

ماہنامہ بیاض

مدیر: عمران منظور

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ۔ ریاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ ۱۶ کلومیٹر ملتان روڈ لاہور

....

ماہنامہ تخلیق

مدیر: سونان اظہر جاوید

قیمت فی شمارہ: -/۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: ہاؤس نمبر ۱۲/۴ شیراز ولاز فیز

اسلام نگر والٹن روڈ لاہور کینٹ

....

سہ ماہی چہار سُو

مدیر: سُول گلزار جاوید

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: d-1 ۵۳۷ گلی نمبر ۱۸ ویسٹریج III راولپنڈی

....

ماہنامہ تارکین وطن

چیف ایڈیٹر: میاں منظور شاہد

قیمت فی شمارہ: -/۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: ۴۹ کشمیر بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ماہنامہ حرفِ جعفر فیصل آباد

چیف ایڈیٹر: ڈاکٹر جعفر حسن مبارک

قیمت فی شمارہ: -/۱۰۰ روپے

ملنے کا پتہ: 648-C پیپلز کالونی نمبر 2

....

ماہنامہ ادب دوست

چیف ایڈیٹر: خالد تاج

قیمت فی شمارہ: -/۲۰ روپے

ملنے کا پتہ: 39- کمرشل زون لبرٹی مارکیٹ

گلبرگ III لاہور

نیازت علی نیاز/لاہور

گر تری گفتگو نہیں ہوتی
شاعری سرخرو نہیں ہوتی
زندگی میں نہ ہوں شمار وہ پل
جب خیالوں میں تو نہیں ہوتی
دیکھ کر تجھ کو دل ہو قابو میں
ایسی حالت کبھو نہیں ہوتی
عشق کا خاک لطف آتا ہے
آنکھ جب تک لہو نہیں ہوتی
میں کسی بات پہ نہیں حیراں
اور کوئی جستجو نہیں ہوتی
درد رنج و الم نہ ہوں جب تک
زندگی کی نمو نہیں ہوتی
جہد پیہم ہے زندگی اے نیاز
یہ فقط آرزو نہیں ہوتی

کسی پنجابی ادیب کو اردو زبان پر تشدد کرتے نہیں دیکھا۔

اُردو زبان کی جتنی نشو و نما پنجاب میں ہوئی ہے کہیں نہیں ہوئی۔

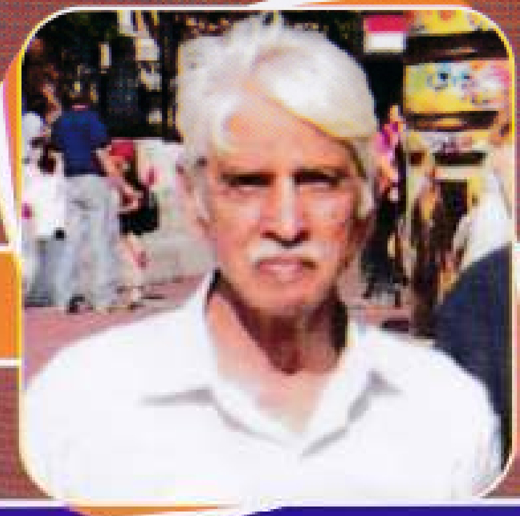

کینیڈا کے شہر ٹورانٹو میں پہنچ کر یوں لگتا ہے جیسے دوسرے پنجاب بلکہ اصلی پنجاب میں آ گیا ہوں۔

پنجابی شاعری تو کسی حد تک قابل ذکر ہے لیکن نثر پر تو ایک قسم کا جمود طاری ہے۔

پنجابی کے نامور شاعر، ادیب اور دانشور پروفیسر عاشق رحیل سے حسن عباسی کی گفتگو

اردو رنگ: اپنی ابتدائی زندگی سے متعلق کچھ بتایئے۔

عاشق رحیل: میری پیدائش مشرقی پنجاب کے ضلع جالندھر کے مشہور قصبے نور محل کی ہے۔ مشہور میں نے اسے اس لیے کہا ہے کہ جب نور جہاں جہانگیر کی ملکہ بنی تو اس نے اس جگہ ایک بہت بڑی سرائے بنوائی تھی۔ جس کا نام نور جہاں محل رکھا گیا تھا۔ اس کے اردگرد آبادی ہوئی تو یہ نور جہاں محل کی بجائے صرف نور محل ہی رہ گئی۔ یہ ایک لمبی تاریخی داستان ہے۔ جو یہاں بیان نہیں کی جا سکتی۔ بہرحال نور محل کی سرائے اب تک پورے مشرقی پنجاب میں مشہور ہے۔ یہ قصبہ نور محل میرا ننھیال تھا۔ میں اپنے والدین کی پہلی اولاد ہونے کی وجہ سے اس وقت کے رواج کے مطابق اپنے ننھیال میں ہی پیدا ہوا تھا۔ میرے والد صاحب اس وقت کی ریاست پٹیالہ کے ایک چھوٹے سے قصبے میں کاشتکاری کرتے تھے۔ ایک تو اس قصبے میں تعلیم و تربیت کا معقول بندوبست نہیں تھا۔ دوسرے مجھے پیدا ہوتے ہی میری والدہ سے ان کی بڑی بہن نے اپنی گود لے لیا تھا۔ کیونکہ ان کی اپنی کوئی اولاد نہیں تھی۔ یہ میرے والدین کا حوصلہ تھا کہ انہوں نے اپنے پہلے بچے کو دوسرے کے حوالے کر دیا تھا۔ میرے بعد میرے اور بہن بھائی بھی ہوئے لیکن میں نے اسی قصبے کے ڈسٹرکٹ بورڈ ہائی سکول میں ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ الیہ یہ تھا کہ میری خالہ جنھوں نے مجھے گود لیا تھا وہ بھی حقیقی اولاد بنا کر پالا۔ بڑھاپا اور آخری دم تک مجھے اپنے سینے سے لگائے رکھا۔

1947ء میں ملک تقسیم ہوا تو میں اپنی والدہ اور ماموؤں کے ساتھ پاکستان آ گیا۔ اتفاق کی بات ہے کہ میری حقیقی والدہ بھی اپنی بیماری کی وجہ سے میرے ایک چھ مہینے کی عمر کے بھائی اور مجھ سے چھوٹی بہن کے ساتھ ہمارے پاس ہی آئی ہوئی تھیں۔ وہ بھی

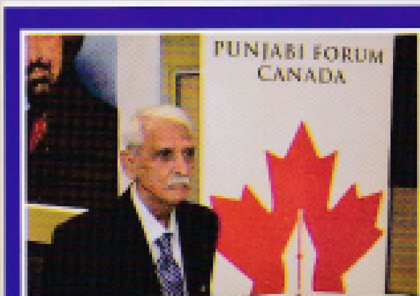

میرے نزدیک پنجابی ادیب کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ پنجابی ادب پڑھے بھی۔

وقت کی یہ موہن روڈ ''اردو بازار'' بن چکی ہے۔ یہاں مجھے بہت شفیق اساتذہ کی سرپرستی ملی جن کی شفقت سے میں نے مڈل اور میٹرک کے امتحان بہت نمایاں پوزیشن میں وظائف حاصل کر کے پاس کیے۔ میٹرک کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوا جس کی دیوار مسلم ماڈل سکول سے ملی ہوئی ہے۔ یہاں بھی میں نے ہر امتحان میں پورے پنجاب میں اچھی پوزیشن لے کر وظائف حاصل کیے اور ایم اے ریاضی پاس کرنے کے بعد اس کالج کو چھوڑا۔ اللہ تعالیٰ کی مہربانی سے مجھے انگلینڈ جا کر لندن یونیورسٹی سے بھی ایم ایس سی (ریاضی) کرنے کا موقع ملا۔ اس ساری تعلیم میں میری ماں کی دعائیں شامل تھیں۔ گورنمنٹ کالج جو اَب یونیورسٹی بن چکا میں تعلیم حاصل کرنا بڑے فخر کی بات سمجھا جاتا ہے۔ مزے اور خوشی کی بات ہے کہ تعلیم کے دوران میرا کوئی پیسہ خرچ نہیں ہوا بلکہ میں نے گورنمنٹ سے وظیفوں کی صورت میں پیسے وصول کر کے تعلیم حاصل کی۔ جس وقت میں نے تعلیم مکمل کی اس وقت ون یونٹ قائم تھا۔ چنانچہ میں نے سروس شروع کی تو پہلے لاہور میں ہی لیکچرر ریاضی کے طور پر گورنمنٹ کالج گلبرگ میں جگہ مل گئی لیکن چھ مہینے بعد ہی مجھے مانسہرہ بھیج دیا گیا جہاں مرحوم صدیق سالک اور میں ایک ہی مکان میں رہتے رہے۔ وہاں چارسدہ جانا پڑا جہاں محسن احسان مرحوم میرے کولیگ رہے۔ پھر صوابی اور وہاں سے مردان

دنیا میں واحد پنجاب ہی ایسا بدنصیب صوبہ ہے جس کے پرائمری سکول میں طالب علموں کو اپنی مادری زبان نہیں پڑھائی جاتی۔

بیواؤں جیسی زندگی ہی گزار رہی تھیں۔ کیونکہ ان کے شوہر نے دوسری شادی کی ہوئی تھی اور وہ رہتے بھی شاید کلکتہ یا ڈھاکہ میں تھے۔ گیارہ بارہ سال کی عمر تک میں نے اپنے آبائی شہر گیا بھی صرف ایک دو دفعہ تھا اور میری حقیقی والدہ بھی جب بچے آتیں تو اکثر اکیلی آتی تھیں۔ اس طرح میں نے اپنے باپ کو خواب میں ہی دیکھے لگتا ہے۔ میری زبان ''ابا'' کے لفظ سے ہی ناشناس ہے۔ میری ماں اور میرا باپ میری وہی خالہ رہیں جنھوں نے مجھے اپنی

ہمارے ساتھ ہی آ گئیں اور ہم سب لاہور کے علاقے نیلا گنبد میں ایک چھوٹے سے مکان میں رہنے لگے۔ لاہور آ کر پتہ چلا کہ میرے والد اور دادی صاحبہ کو ان کے قصبے میں ہی شہید کر دیا گیا ہے جن کی قبر مجھے پورا مشرقی پنجاب میں محسوس ہوتا۔

ہم اکتوبر یا نومبر 1947ء کو لاہور آئے تھے۔ چنانچہ اسی سال کسی سکول میں داخلہ لینا ناممکن تھا۔ 1948ء میں مجھے مسلم ماڈل ہائی سکول موہن روڈ میں آٹھویں جماعت میں داخلہ ملا۔ اس

کالج میں ایک ہی سال گزارا تھا کہ ون یونٹ ٹوٹ گیا اور میں ڈیرہ غازی خان کالج سے ہوتا ہوا گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ لاہور آ گیا اور یہیں سے ریٹائر ہوا۔ صوبہ سرحد کے قیام کے دوران پشتو بھی سیکھی اور ساتھ ہی پشتو بولنے والی پیاری بیوی ملی جس کا پیار میرے بڑھاپے کا سہارا بنا ہوا ہے۔ جواَب کچھ زیادہ ہی طویل ہو گیا ہے لیکن مجبوری تھی۔

(بقیہ اگلے صفحات پر)

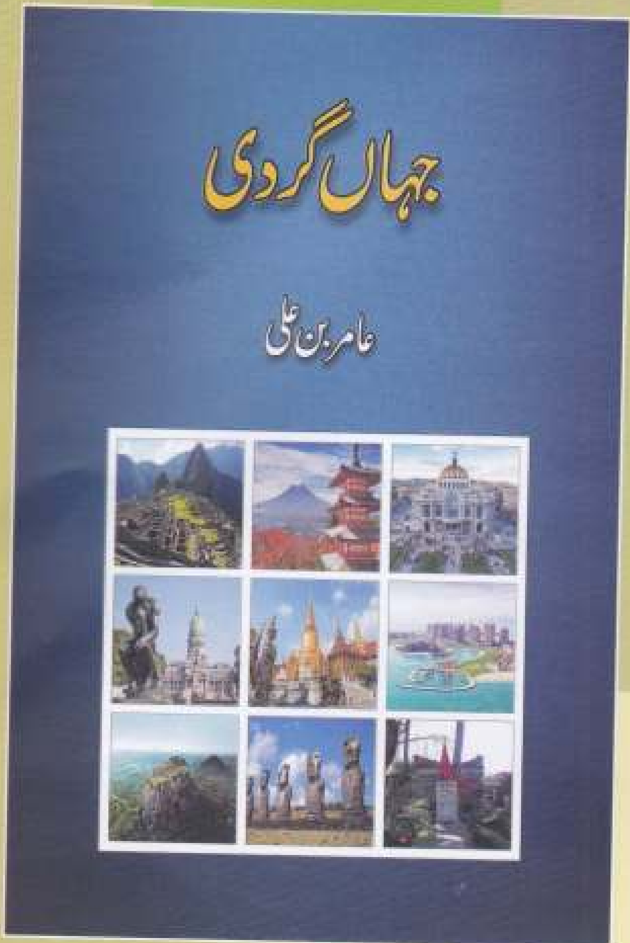

قیمت 300 روپے

نامور شاعر، منفرد کالم نویس اور ممتاز مترجم

عامر بن علی

کا آٹھ ممالک کا سیاحت کا سفرنامہ

جہاں گردی

شائع ہوگیا ہے

Amir Bin Ali is one of the finest Poets from younger generation that have emerged during last decade.
(Express Tribune Book Review)

Staying away from his homeland makes Amir Bin Ali skeptical that he might get disconnected from his past, it is evident from his poetry and prose that he loves his country a lot and want to stay connected. He is successfully doing so through his writings.
(Daily The Nation Book Review)

عامر بن علی کا ادبی سفر

- محبت چھوگئی دل کو (شعری مجموعہ)
- چلو اقرار کرتے ہیں (شعری مجموعہ)
- سرگوشیاں (شعری مجموعہ)
- یاد نہ آئے کوئی (شعری مجموعہ)
- محبت کے دو رنگ - گبریلا مسترال اور پابلو نرودا (ہسپانوی زبان سے براہ راست اردو میں کیے گئے تراجم)
- گفتگو (انٹرویوز)
- مکتوب جاپان (کالمز)
- آج کا جاپان (سفرنامہ)
- محبت کے موسم (زیر طبع)
- گردِ سفر (زیر طبع)
- مدیر اعلیٰ: ماہنامہ ارژنگ لاہور

اپنے قریبی بک سٹال سے آج ہی طلب فرمائیں۔
کتاب خریدنے کے لیے براہ راست بھی ہم سے رابطہ کیا جاسکتا ہے۔

Read Arxang Online
www.amirbinali.com
www.millat.com

نستعلیق
Publications
غزنی سٹریٹ • اردو بازار • لاہور
0300-4489310 - 0331-4489310
nastalique786@gmail.com